ماہنامہ حیدرآباد

صدائے شبلی

Monthly Hyderabad

SADA E SHIBLI

نومبر 2024 Nov جلد: 7 Vol: شمارہ: 81 Issue:

ISSN: 2581-9216

مدیر:

ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

نائب مدیران:

ڈاکٹر عبدالقدوس

ڈاکٹر سراج احمد انصاری

ابو ہریرہ یوسفی

قیمت فی شمارہ:	20/-
سالانہ:	220/-
رجسٹرڈ ڈاک:	350/-
بیرونی ممالک:	50/-امریکی ڈالر
خصوصی تعاون:	2000/-

SADA E SHIBLI
A/c: 1327102000023922
Ifsc: IBKL0001327
IDBI Bank: CHARMINAR HYD, T.S

Email: sadaeshibli@gmail.com

Mob: 9392533661 - 8317692718

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' حیدرآباد میں مقالہ نگاران سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

مجلس مشاورت:

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی۔ پروفیسر مظفر علی شہ میری
پروفیسر محسن عثمانی ندوی۔ پروفیسر ابوالکلام
پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی۔ ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی
مفتی محمد فاروق قاسمی۔ مولانا ارشاد الحق مدنی
ڈاکٹر نادر المسدوسی۔ الحاج سید عظمت اللہ بیابانی
مولانا محمد مساعد ہلال احیائی۔ اعجاز علی قریشی ایڈوکیٹ۔ محمد سلمان انجینئر

مجلس ادارت:

ڈاکٹر محمد رفیق۔ ڈاکٹر حمران احمد۔ ڈاکٹر ناظم علی
ڈاکٹر مختار احمد فردین۔ ڈاکٹر غوثیہ بانو
ڈاکٹر سید امام حبیب قادری۔ ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی
ڈاکٹر سمیہ تمکین۔ ڈاکٹر صالحہ صدیقی۔ ڈاکٹر نوری خاتون
ڈاکٹر فاروق احمد بھٹ۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان
ڈاکٹر آصف لئیق ندوی۔ ڈاکٹر مظفر علی ساجد۔
مولانا عبدالوحید ندوی۔ مولانا احمد نور عینی
ابو ہریرہ ایوبی۔ محسن خان

ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف حیدرآباد کی عدالت میں ہوگی

محمد محامد ہلال (اونر، پبلشر، پرنٹر، ایڈیٹر) نے دائرہ الیکٹرک پریس میں چھپوا کر حیدرآباد تلنگانہ سے شائع کیا

خط و کتابت کا پتہ

MOHD MUHAMID HILAL #17-6-352,
B1, 2nd Floor,Bafana Complex,
Dabirpura Road, Purani Haveli,
Hyderabad- 500023. T.S

فہرست مضامین

۱	اپنی بات	ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی	۵
۲	اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	علامہ شبلی نعمانیؒ	۶
۳	**صالحیت**	مولوی حبیب الرحمٰن	۷
۴	**غزل**	پروفیسر مظفر شہ میری	۹
۵	تجاہل عارفانہ: ایک کامیاب حکمت عملی	ڈاکٹر محمد اعظم ندوی	۱۰
۶	انجام گلستاں کیا ہوگا	ڈاکٹر جوہی بیگم	۱۴
۷	علی گڑھ تحریک کی علمی وادبی خدمات	محمد شاہد الاعظمی	۱۸
۸	سلام بر سول اکرم ﷺ	سید جہانگیر بیابانی	۲۰
۹	تعلیم کے فروغ میں علامہ شبلی نعمانی کا کردار	فائزہ عظیم احمد	۲۱
۱۰	**غزل**	اقبال درد	۲۵
۱۱	**ماں**	سید عظمت اللہ بیابانی	۲۶
۱۲	تحفظِ آئین پر نظم	ولی محمد زاہد ہریانوی	۲۷
۱۳	غضنفر کے افسانوں کا تنقیدی مطالعہ	تنظیم فاطمہ	۲۸
۱۴	پری ناز اور پرندے-ایک تنقیدی مطالعہ (پانچویں قسط)	ڈاکٹر ناظر حسین خان	۳۱
۱۵	علامہ شبلی نعمانی (1857-1914)	احمد نور عینی	۳۶
۱۶	اقبال اور آزاد ایک ہی عہد کے دو بڑے مفکر	واحد علی خان ایڈوکیٹ	۳۸
۱۷	مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاسی، مذہبی، سماجی، ادبی وصحافتی خدمات....	ڈاکٹر نادر المسدوسی	۴۰
۱۸	یوم تعلیم پر مولانا ابوالکلام آزاد کو خراج عقیدت	ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی	۴۱

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کے خصوصی معاونین

جناب **ابوسفیان اعظمی**، مقیم حال ممبئی

جناب **محمد یوسف** بن الحاج محمد منیر الدین عرف ولی مرحوم، حیدرآباد

مفتی **محمد فاروق قاسمی**، صدر علماء کونسل وجے واڑہ، آندھرا پردیش

الحاج سید **عظمت اللہ بیابانی**، وجے نگر کالونی، حیدرآباد

مولانا **منصور احمد قاسمی**، معین آباد، تلنگانہ

الحاج **رئیس احمد اقبال**، انجینئر صدر سہارا ویلفیئر سوسائٹی، حیدرآباد

الحاج **محمد زکریا** انجینئر (داماد استاذ الاساتذہ حضرت عبدالرحمٰن جامیؒ)

ڈاکٹر **شہباز احمد**، پروفیسر گورنمنٹ نظامیہ طبی کالج چارمینار، حیدرآباد

مولانا **محمد عبدالقادر سعود**، نائس جوس سینٹر سکندرآباد، حیدرآباد

الحاج **محمد قمرالدین**، نبیل کالونی بارکس حیدرآباد

الحاج **محمد عبدالکریم**، صدر مسجد اشرف کریم کشن باغ، حیدرآباد

اپنی بات

ماہ نومبر میں کئی ہمارے ملک کی انقلابی شخصیات پیدا ہوئیں اور وفات بھی پائیں، انہیں میں ۸/نومبر کو شہنشاہ ٹیپو سلطان ہیں۔ ٹیپو سلطان تخلیقی دماغ اور بہادر تھے، وہ تمام مذاہب کا احترام کرتے تھے، ان کا دور ریاست میسور کا سنہرا دور ہے، جس میں علوم وفنون کی خوب ترقی ہوئی اور انسانیت کا بول بالا ہوا۔ ان کا مشہور قول ہے شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے بہتر ہے۔ وہ انگریزوں کی عیاری حکومت کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے، ان کی آرزو تھی کہ ہمارے ملک ہندوستان سے انگریز باہر ہو جائیں اسی کوشش میں وہ سرنگاپٹنم کے قلعہ کے دروازے پر لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اللہ رب العزت انھیں اعلیٰ علیین میں داخل کرے آمین۔

۹/نومبر کو علامہ اقبال کی یوم پیدائش ہے، علامہ اقبال کی وجہ سے اردو زبان وادب کا نمایاں فروغ ہوا، اسی بنا پر اس روز کو یوم اُردو سے موسوم کیا گیا ہے۔ علامہ اقبال نے بچوں، جوانوں اور کئی طرح کے موضوعات پر موضوعاتی نظمیں لکھیں، شکوی، جواب شکوی ان کی مشہور نظم ہے، اس نظم کے آخری شعر یعنی کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں ☆ یہ جہاں چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں۔ اس شعر سے، علامہ اقبال کی فکر کا اندازہ ہوتا ہے، علامہ اقبال کی غزلیں مختلف رنگ میں تغزل سے بھر پور ہیں جو قومی، اسلامی، انسانی، نفسیاتی، اخلاقی، سیاسی، تہذیبی اور سماجی موضوعات پر مشتمل ہیں۔ علامہ اقبال کی فکر کو ڈاکٹر سید عابد حسین کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں: ''اقبال کی شاعری آب حیات کا خزانہ ہے۔ جن سے زندگی اور زندہ دلی کے چشمے اُبلتے ہیں''

۱۱/نومبر کو مولانا ابوالکلام آزاد پیدا ہوئے، مولانا آزاد نے ملک کی آزادی کے لئے جو جدوجہد کی ہے وہ انمٹ نقوش ہیں، مولانا آزاد کامیاب مقرر، بے باک صحافی، عمدہ مفسر قرآن، وہ ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار تھے، آزادی کے خاطر انہوں نے جیل کی صعوبتوں کو برداشت کیا، آزادی کے بعد وہ ملک کے پہلے وزیر تعلیم ہوئے اور انہوں نے اپنے دور وزارت میں کئی ادارے قائم کیے جو قوم وملک کو مضبوط کر رہے ہیں، ان کی یوم پیدائش پر ملک بھر میں یوم تعلیم منایا جاتا ہے اور سبھی پروگرام میں یہ عہد کیا جاتا ہے کہ تعلیم ہی بڑی طاقت ہے اس سے ملک قوم وملت مضبوط ہوتی ہے۔

مولانا آزاد کی 136 ویں یوم پیدائش، یوم قومی تعلیم واقلیتی بہبود کے موقع پر تلنگانہ اُردو اکیڈمی نے اہم شخصیات کو ان کی تعلیمی، سماجی، ادبی، صحافی اور ملّی خدمات پر ایوارڈ واعزاز سے نوازا۔ اس باوقار ایوارڈ کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد قومی ایوارڈ جناب زاہد علی خان، جناب سید آصف پاشاہ، محترمہ لکشمی دیوی راج، سینئر ایڈوکیٹ غلام یزدانی، جناب امین الحسن جعفری (تحقیق وتنقید کے زمرہ میں) پروفیسر نسیم الدین فریس مخدوم ایوارڈ، سات مختلف زمرہ میں کارنامۂ حیات ایوارڈ (شاعری) ڈاکٹر طیب پاشاہ قادری، معین الدین امر بمبو، انجنی کمار گوئل، افسر عثمانی، ایلٹر بیٹھ کورین، اطیب اعجاز (فکشن) ثریا جبین، حمید عادل، محمد عبدالقدوس رضوان (تحقیق وتنقید) ڈاکٹر اظہر سلطانہ، ڈاکٹر ایم عبدالقدیر، ڈاکٹر محمد عبدالقوی (تعلیم) جعفر جری، چاند بی بی، محمد محبوب، فروغ اردو، شیخ احمد ضیاء، محمد رفیع الدین فاروقی، رفیعہ نوشین، صحافت، احمد علی خان محمد جاوید علی رفیق شاہی ہیں۔ تمام ایوارڈ یافتگان کی خدمت میں شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد کی جانب سے مبارک باد پیش کی جاتی ہے۔

۱۸/نومبر کو علامہ شبلی نعمانی کا یوم وفات ہے، علامہ شبلی عظمت رفتہ کے متلاشی تھے، انہوں نے اس کے لئے علم وادب کا راستہ چنا اور اس کے لئے افراد تیار کئے، ادارہ ان کے لئے دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے (آمین)

اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ شبلی نعمانیؒ

ایک بڑھیا خدمت اقدس میں آئی کہ حضور میرے لیے دعا فرمائیں کہ مجھ کو بہشت نصیب ہو، آپ ﷺ نے فرمایا بڑھیاں بہشت میں نہ جائیں گی، اس کو بہت صدمہ ہوا اور روتی ہوئی واپس چلی، آپ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ اس سے کہہ دو کہ ''بڑھیاں جنت میں جائیں گی لیکن جوان ہوکر جائیں گی''۔

ایک بدوی صحابیؓ تھے، جن کا نام زاہرؓ تھا، وہ دیہات کی چیزیں آپ ﷺ کی خدمت میں ہدیہ بھیجا کرتے تھے، ایک دفعہ وہ شہر میں آئے، گاؤں سے جو چیزیں لائے تھے، ان کو بازار میں فروخت کررہے تھے، اتفاقاً آپ ﷺ ادھر سے گذرے، زاہرؓ کے پیچھے جاکر ان کو گود میں دبالیا انھوں نے کہا کون ہے چھوڑ دو، مڑکر دیکھا تو سرور عالمؐ تھے، اپنی پیٹھ اور بھی آنحضرت ﷺ کے سینہ سے لپٹادی، آپ ﷺ نے فرمایا کوئی اس غلام کو خریدتا ہے! بولے کہ یارسول اللہ! مجھ جیسے غلام کو جو شخص خریدے گا نقصان اٹھائے گا، آپؐ نے فرمایا لیکن خدا کے نزدیک تمہارے دام زیادہ ہیں۔

ایک شخص نے آکر شکایت کی کہ میرے بھائی کے شکم میں گرانی ہے، فرمایا شہد پلاؤ، وہ دوبارہ آئے کہ شہد پلایا لیکن شکایت اب بھی ہاتی ہے، آپ ﷺ نے پھر شہد پلانے کی ہدایت کی، سہ بارہ آئے، پھر وہی جواب ملا، چوتھی بار آئے تو ارشاد فرمایا کہ ''خدا سچا ہے (قرآن میں ہے کہ شہد میں شفا ہے) لیکن تمہارے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے، جاکر شہد پلاؤ'' اب کی پلایا تو شفا ہوگئی۔ معدہ میں مادۂ فاسد کثرت سے موجود تھا، جب پورا استقیہ ہوگیا تو گرانی جاتی رہی۔

اولاد سے محبت: اولاد سے نہایت محبت تھی معمول تھا کہ جب کبھی سفر فرماتے تو سب سے آخر میں حضرت فاطمہ کے پاس جاتے اور سفر سے واپس آتے تو جو شخص سب سے پہلے باریاب خدمت ہوتا، وہ بھی حضرت فاطمہؓ ہی ہوتیں، ایک دفعہ کسی غزوہ میں گئے، اس اثنا میں حضرت فاطمہؓ نے دونوں صاحبزادوں (حسنین علیہما السلام) کے لیے چاندی کے کنگن بنوائے اور دروازے پر پردے لٹکائے، آنحضرت ﷺ واپس تشریف لائے تو خلاف معمول حضرت فاطمہؓ کے گھر نہیں گئے، وہ سمجھ گئیں فوراً پردوں کو چاک کرڈالا اور صاحبزادوں کے ہاتھ سے کنگن اتار لیے، صاحبزادے روتے ہوئے خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، آپ ﷺ نے کنگن لے کر بازار میں بھیج دیے کہ ان کے بدلے ہاتھی دانت کے کنگن لادو۔ حضرت فاطمہؓ جب آپ کی خدمت میں تشریف لاتیں تو آپ ﷺ کھڑے ہوجاتے، ان کی پیشانی چومتے اور اپنی نشست گاہ سے ہٹ کر اپنی جگہ بٹھاتے۔

ابوقتادہؓ کا بیان ہے کہ ہم لوگ مسجد نبویؐ میں حاضر تھے کہ دفعتاً رسول اللہ ﷺ امامہؓ (آنحضرت ﷺ کی نواسی تھیں) کو کندھے پر چڑھائے ہوئے تشریف لائے اور اسی حالت میں پوری نماز پڑھائی، جب رکوع میں جاتے تو ان کو اتار دیتے، پھر کھڑے ہوتے تو چڑھالیتے، اسی طرح نماز ادا کی۔

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نے کسی کو اپنے خاندان سے اتنی محبت کرتے نہیں دیکھا، جس قدر آپ ﷺ کرتے تھے، آپؐ کے صاحبزادے حضرت ابراہیمؓ عوالی میں پرورش پاتے تھے، جو مدینہ سے تین چار میل ہے، ان کے دیکھنے کے لیے مدینہ سے پیادہ پا جاتے، گھر میں دھواں ہوتا رہتا تھا، گھر میں جاتے بچہ کو لاناً کے ہاتھ سے لے لیتے اور منہ چومتے، پھر مدینہ کو واپس آتے۔

(سیرۃ النبیؐ، جلد: دوم، ص: ۳۱۶-۳۱۷)

مولوی حبیب الرحمن۔حیدرآباد

صالحیت

جاہل اقوام کے متعلق سنتِ الٰہی

حُبِ دنیا' شرک' کفر و نفاق یہ سب جہالت کا نتیجہ ہیں۔اللہ تعالیٰ نے گمراہ قوموں کو"قوم لایعقلون"(نادان قوم) فرمایا ہے۔ دنیا کی کوئی قوم' جسم وصورت کی پرورش' تزئین وآسائش وآرائش کے لئے اختراع وایجاد میں کتنا ہی ماہر کیوں نہ ہو۔اگر وہ مذکورہ بالا غیر فطری افکار میں مبتلا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں جاہل اور جانوروں سے بدتر ہے خواہ دنیا میں اس کو کتنا ہی اقتدار وغلبہ حاصل ہو۔ یہ اقتدار دراصل قدرت کی طرف سے ان کے قلب ونظر پر غفلت کا پردہ ہوتا ہے۔ نیز اللہ رحیم وحلیم کی طرف سے مہلت بھی ہوتی ہے۔ یہ جاہل قومیں اس زعم میں مست رہتی ہیں کہ غیر فطری افکار و اعمال میں مبتلا ہونے کے باوجود ان کو دنیا میں جو اقتدار و حکومت حاصل ہے وہ ان پر اللہ تعالیٰ کی عنایت ومہربانی ہے۔حالانکہ یہ اقتدار ومہلت یعنی ان سے اس عالم میں پکڑ اور عذاب نہ ہونا اس بات کی علامت نہیں ہے کہ حق تعالیٰ ان پر مہربان ہیں بلکہ قدرت کی طرف سے ڈھیل اس لئے ہے کہ وہ اپنے باطل زعم میں مبتلا رہیں اور زندگی کے اوراق کو زیادہ سے زیادہ سیاہ کرتی رہیں۔"وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِیْ لَهُمْ خَیْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ اِنَّمَا نُمْلِیْ لَهُمْ لِیَزْدَادُوْٓا اِثْمًا" (سورہ اٰل عمران:178) ترجمہ:(کافر یہ خیال ہرگز نہ کریں کہ ہم نے ان کو جو مہلت دی ہے وہ ان کے لئے بہتر ہے۔ ہم ان کو صرف اس لئے مہلت دے رہے ہیں (داروگیر نہیں کررہے ہیں) کہ وہ گناہوں میں اضافہ کرتے رہیں۔) تاکہ اسی طغیان' سرکشی وکفر کی حالت میں ان کو موت آئے۔ "تَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ" (سورہ توبہ:85)۔

مسلم کی دانش وبینش

ان جاہل بااقتدار قوموں کے متعلق ایک مسلم کی یہی دانش ہونی چاہئے کیونکہ مسلم وہی ہے جو اپنے دل ودماغ کو صرف علمِ حق کے نور سے منور رکھتا ہے اور جاہل اقوام کے غیر حقیقی' غیر فطری افکار وخیالات سے اور ان کی تہذیب و تمدن سے نہ متاثر ہوتا ہے نہ مرعوب' چاہے وہ کتنے ہی بلند و خوش نما کیوں نہ معلوم ہوتے ہوں۔ زمانہ کتنی ہی کروٹیں بدلے۔ دنیا کے حوادث وانقلابات نت نئی صورتیں اختیار کریں۔ زندگی کے نئے نئے نظریہ اور مقاصد سامنے آئیں مگر مسلم کا نظریہ ومقصدِ حیات وہی ہوتا ہے جو حیات آفریں (قرآن) نے مقرر کردیا ہے۔یعنی"مغفرتِ الٰہی اور الجنۃ" اور اس مقصد کے پانے کے لئے اس کے وہی فرائض زندگی ہوتے ہیں جو زندگی عطا کرنے والے نے متعین کردیئے ہیں۔اس کے خلاف جو روش ومسلک اس کے سامنے پیش

کیا جائے۔ کتنے ہی دباؤ قوت سے پیش کیا جائے۔ مؤمن اس کو ٹھکرا دیتا ہے۔

غرض ان جاہل قوموں کی وقعت اس کی نظروں میں مچھر کے پَر کے برابر بھی نہیں ہوتی۔ خواہ وہ مشرق و مغرب کے اہلِ حل وعقد ہی کیوں نہ ہو۔ مگر افسوس کہ مسلمان ان پڑھ ہوں کہ تعلیم یافتہ ان کے قلوب کا جائزہ لیجئے تو دین کی صحیح تعلیم نہ ہونے سے ان جاہل اقوام کی طرح ان کے قلوب میں بھی دنیا مرجح ہے اور آخرت مؤخر یعنی حبِ دنیا کا فاسد مادہ اور شرک و کفر و نفاق کی مہلک بیماریاں کم و بیش پرورش پاتی نظر آتی ہیں۔ جن لوگوں کی نظر ان بیماریوں پر ہے وہ مسلمانوں کو اسلام و ایمان کی طرف بلاتے ہیں اور ان کو حقیقی مسلمان بننے کی دعوت دیتے ہیں، دین و ایمان کی صحت و سلامتی کی طرف توجہ دلاتے ہیں اور جن لوگوں کی نظر مسلمانوں کے موروثی دین، قولی ایمان و اسلام پر ہے۔ وہ ان بیماروں کو (صحتمند) مسلم و مومن ہونے کی سند اور مغفرت کا پروانہ عطا کرتے ہیں۔

موروثی اسلام و حقیقی اسلام کا فرق اور جہاد فی سبیل اللہ

واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو اسلام سے جو لگاؤ ہے غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ وہ لگاؤ اس بناء پر ہے کہ دینِ اسلام ان کا موروثی دین ہے یہی وجہ ہے کہ دینی اعمال جن کی غرض و غایت نفس کا تزکیہ اور قلب کی تطہیر ہے تاکہ مومن مجاہد فی سبیل اللہ بنا رہے۔ وہ دینی اعمال صرف رسمی ہو کر رہ گئے کیونکہ دینی اعمال بجالانے کے باوجود نفس کی شرارتیں اور قلب کی گندگی جوں کی توں ہے۔ فکرِ آخرت کے بجائے فکرِ دنیا میں غلطاں و پیچاں۔ ہر وقت کھانے پینے لباس اور تزئین و آرائش کی ہوس، دینداری بھی ہے تو برائے دنیا۔ گھر میں اور گھر سے باہر دین قائم کرنے کی جدوجہد یعنی جہاد فی سبیل اللہ تو گویا نہ کوئی امر دینی ہے اور نہ کوئی نیک کام۔ نتیجہ یہ ہے کہ دنیا پرست قوموں اور معاشی جانوروں کی طرح مسلمانوں کی زبانوں پر بھی معاش معاش کی پکار ہے اور یہ غلط تصور قائم ہوگیا ہے کہ معاشی بے فکری کے بعد دینی اصلاح بآسانی ہوجائے گی۔ دنیا، معاش مقدم ہے اور مفادِ آخرت مؤخر، صحیح دانش یہ ہے کہ جو خیر واقعی ہے وہ مقدم رہے۔ "بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا . وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى" (سورہ الاعلیٰ:17) ترجمہ: (تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت جو خیر واقعی ہے (قابل ترجیح ہے)۔

فکرِ معاش بے شک ضروری ہے بلکہ محمود! مگر وہ فکرِ معاش محمود ہے جس سے آخرت کی زندگی بگڑے نہیں بلکہ اور سنور جائے۔ جس فکرِ معاش سے آخرت برباد اور خدا سے غفلت ہوجائے وہ فکرِ معاش دین و ایمان کی موت ہے۔

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے: کھینچ لی روح (جان) تیری دیکھ کے تجھے فکرِ معاش

اگر دین اسلام کو موروثی دین نہیں بلکہ دینِ الٰہی سمجھ کر اختیار کیا جائے تو یقینی ہے کہ اللہ تعالیٰ اصلاح حال فرمائیں۔ فکر دنیا کے بجائے فکرِ آخرت غالب رہے، نفع دنیا کے بجائے نفع آخرت مرجح اور ضررِ آخرت سے بچنے کے لئے ضرر دنیا گوارا ہوجائے۔ فکر و عمل کی اصلاح یعنی تزکیۂ نفس و تطہیر قلب کی ہمہ وقت دھن رہے اور جان و مال سے جہاد فی سبیل اللہ کی ہمت پیدا ہوجائے اور مسلمان اس زعم

میں مست نہ رہے کہ صرف نماز روزہ کی پابندی سے مغفرت حاصل ہوجاتی ہے۔ بلکہ اس میں یہ قرآنی بصیرت پیدا ہوجائے کہ ''الٰہی ونبوی تعلیم' اصلاحِ حال اور مردِ مجاہد بننے کے لئے ہے اور مغفرت و جنت و درجاتِ جنت' دراصل اشاعتِ حق کی باطل شکن کوشش' غیر قرآنی وغیر مسنون افکار و اعمال کے خلاف جدوجہد کرنے کا غیر فانی بدل ہے۔'' اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ'' (سورہ ال عمران: 142) ترجمہ: (کیا تم نے خیال کرلیا ہے کہ تم جنت میں داخل ہوجاؤ گے حالانکہ ہنوز اللہ تعالیٰ نے تم میں ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے جہاد کیا اور ثابت قدم رہے۔) مطلب یہ ہے کہ جہاد وصبر کی منزل سے گزرے بغیر کوئی جنت میں داخل نہیں ہوسکتا وہ مؤمن ہی نہیں جو مردِ مجاہد نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ''مجاہدانہ عزائم و کردار کے بغیر دین'' موت ہے یا خواب۔

دنیائے باطل' صنم کدہ ہے اور مومن سیدنا ابراہیم خلیل اللہ کا جانشین' لا الہ الا اللہ کی تعلیم میں یہی نکتہ پوشیدہ ہے۔ عموماً اکابرِ امت جس کو فراموش کرچکے ہیں۔

یاد رہے کہ یہ وہ خلاء (کمی) ہے جس کو کوئی نیکی پُر نہیں کرسکتی اور یہ بھی یقینی ہے کہ اللہ تعالیٰ دین وایمان کی سلامتی و ترقی کے ساتھ معاشی سہولتیں بھی بہم پہنچادیتے ہیں۔

صالحیت جو اخلاص کا بنیادی مقام ہے اس سے مافوق (آگے) شہادت کا درجہ ہے جو بندہ مخلص ہوتا ہے وہی بندۂ جاں نثار (شہید) بنایا جاتا ہے۔

(ماخوذ: رہنمائے فطرت، ص: ۱۳۸-۱۴۲)

پروفیسر مظفر شہ میری

سابق وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالحق یونیورسٹی کرنول، آندھراپردیش

غزل

کم ظرف کی ہوئی ہے عنایت کبھی کبھی
ٹوٹی ہے ہم پہ یہ بھی قیامت کبھی کبھی

خود کو بدل کے سانپ کی صورت کبھی کبھی
پلتی ہے آستیں میں رفاقت کبھی کبھی

اتنا کرم تو ہم سے فقیروں پہ چاہیے
میزان دیکھ لیتی عدالت کبھی کبھی

ہوتی ہے سونے چاندی کی خیرات سے بڑی
دو اک کھجور کی بھی سخاوت کبھی کبھی

میں نے کیا معاف عدو کو تو یہ سمجھ
لیتی ہے یہ بھی روپ شجاعت کبھی کبھی

سورج کی شان لے کے کبھی آئے وہ نظر
مہتاب بن کے چھائے محبت کبھی کبھی

آنکھوں میں ہے نمی نہ جبیں پر کوئی شکن
برہم ہوئی ہے یوں بھی طبیعت کبھی کبھی

بے وجہ ہو گیا ہے مظفر کوئی خفا
یوں چاندنی ہوئی ہے اکارت کبھی کبھی

ڈاکٹر محمد اعظم ندوی۔استاذ المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد

تجاہل عارفانہ: ایک کامیاب حکمت عملی

ادب وبلاغت میں 'تجاہل عارفانہ' ایک نہایت لطیف صنعت ہے، جس کا مطلب بہ ظاہر سادہ مگر انتہائی عمیق ہے، لغوی اعتبار سے یہ ترکیب 'عمداً غفلت برتنے' یا 'جان بوجھ کر انجان بننے' کے معنی رکھتی ہے، عربی ادب میں اس صنعت کو ''تجاہل العارف'' کہتے ہیں، جو علم بلاغت کی ایک شاخ بدیع کے تحت آتی ہے اور اسی کی ایک قسم 'المحسّنات المعنویۃ ؟ (تحسین معنوی کے ذرائع) کی مثالوں میں شمار ہوتی ہے، اس کا مقصد کسی معلوم حقیقت کو اس طرح پیش کرنا ہوتا ہے گویا وہ غیر معلوم ہو، یوسف سکّا کی (و:۶۲۶ھ) اس صنعت کی تشریح یوں کرتے ہیں:"سوق المعلوم مساق غیرہ" (ایک معلوم حقیقت کو اس انداز میں پیش کرنا کہ وہ غیر معلوم محسوس ہو) (مفتاح العلوم، یوسف السکا کی، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۷۸۹۱، ص۲۴۷)، اور ایسا کسی خاص مقصد سے کیا جاتا ہے جیسے زجر وتوبیخ یا چھپے ہوئے انداز میں اظہار ناراضگی وغیرہ، تجاہل اور تغافل کا ذکر ہماری کلاسیکی شاعری میں خوب ہے کہ محبوب کو عاشق کی بے قراری اور دوری ومجبوری کے سبب درد وکرب کی پوری خبر ہے، پھر بھی وہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اسے کچھ پتہ ہی نہیں، گویا اصطلاح میں تجاہل عارفانہ سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص کسی شے یا حقیقت سے خوب واقف ہونے کے باوجود شعوری طور پر اس طرح لاعلمی کا اظہار کرے، جیسے وہ حقیقت اس کی نگاہ میں پوشیدہ ہے، یہ ایک ایسی تکنیک ہے جس کے ذریعہ انسانی احساسات کو پردۂ غفلت میں چھپا کر ایک مختلف انداز میں بیان کیا جاتا ہے، غالبؔ کا مشہورِ زمانہ شعر اس کی ایک بہترین مثال ہے:

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟
کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا!

یہاں غالبؔ اپنی شناخت سے بخوبی آگاہ ہیں، مگر شعوری طور پر لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے اپنی ذات کو اس قدر گہرائی میں چھپا دیتے ہیں کہ گویا ان کی حقیقت کو بیان کرنا ممکن نہیں، وہ اپنے وجود کی پیچیدگی کو مخاطب کے سامنے اس طرح رکھتے ہیں کہ ان کی شخصیت کی وسعتوں کا ادراک کوئی اور کرے، یہی تجاہل عارفانہ کا کمال ہے کہ ایک معروف اور جیتی جاگتی حقیقت کو اس طرح پیش کیا جائے جیسے وہ پوشیدہ اور خاموش ہو بالکل اس طرح جیسے ایک روشن شمع کسی فانوس میں روپوش ہو۔

لیکن یہاں ہماری مراد تجاہل عارفانہ سے وہ کیفیت ہے جسے عربی میں ''تغافل'' اور ''تغاضی'' کہا جاتا ہے، اردو میں اسے چشم پوشی یا اغماض نظر بھی کہہ سکتے ہیں، اور انگریزی میں trategic Ignorance کہا جا سکتا ہے، یہ ایک ایسی تربیتی اور سماجی حکمت عملی ہے جس کے تحت انسان دانستہ طور پر دوسروں کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں کو نظر انداز کرتا ہے اور ان پر گرفت کرنے سے گریز کرتا ہے، یہ رویہ معاشرتی تعلقات کو بہتر بنانے اور ذہنی سکون کو برقرار رکھنے میں مددگار ہوتا ہے، اس رویہ کو عموماً اساتذہ، والدین، بڑوں اور دوستوں کے مثبت کردار اور حکیمانہ رہنمائی کے تناظر میں استعمال کیا جاتا ہے، بلخ کے ایک بڑے عالم اور صاحب دل بزرگ حاتم الاصم (و:۲۳۷ھ) تھے، جن کو اس امت کا لقمان حکیم کہتے

تھے، ان کے پاس ایک خاتون کسی مسئلہ کی بابت کچھ دریافت کرنے آئی، عورت سے دوران گفتگو غفلت میں طبعی آواز نکل گئی، انہوں نے کہا: کیا کہہ رہی ہو! زور سے کہو؛ تاکہ وہ سمجھے کہ ان کی توجہ گفتگو پر ہے، کسی اور جانب نہیں، اور انہوں نے کچھ سنا ہی نہیں، جب وہ اس کی گفتگو نہیں سن سکے تو کوئی اور آواز کہاں سنی ہوگی؟ اس نے سکون کی سانس لیتے ہوئے کہا: یہ تو "اصم" (بہرے) ہیں یا اونچا سنتے ہیں، جب کہ انہوں نے دانستہ اس کو سبکی اور شرمندگی سے بچا لیا تھا (طبقات الأولیاء، ابن الملقن، مکتبۃ الخانجی، مصر، ۱۹۹۴، ص ۱۷۸) ان کا یہ واقعہ ہمیں سکھاتا ہے کہ کبھی کبھی دوسروں کی غلطیوں اور خود ان کو آپ شرمسار کرنے والی حرکتوں پر تجاہل عارفانہ کا رویہ ان کی عزت نفس کا تحفظ کرتا ہے، حضرت حسن بصریؒ (و: ۱۱۰ھ) فرماتے ہیں: "**ما استقصى كريمٌ قط**" (کوئی شریف النفس انسان کسی سے استفسار میں یا اپنے گرد و پیش کی باتوں میں بال کی کھال نہیں نکالتا) (تفسیر البغوی، دار طیبۃ للنشر والتوزیع، ۱۹۹۷، ج ۸، ص ۱۶۴)۔

تربیت کے میدان میں تجاہل عارفانہ ایک بہترین طریقہ ہے، بچوں کی فطرت ہے کہ وہ دنیا کو تجربات کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، اور اس عمل میں اکثر خطائیں سرزد ہو جاتی ہیں، اگر ہر غلطی پر فوری گرفت کی جائے تو بچہ کی خود اعتمادی متاثر ہوسکتی ہے اور وہ سیکھنے کی صلاحیت کھوسکتا ہے، ایک طرز تربیت تھا جس کو ہیلی کاپٹری پرورش Helicopter parenting کہتے ہیں، جس میں والدین بچوں کے مسائل پر کافی قریبی توجہ دیتے ہیں، یعنی ہیلی کاپٹر کی طرح تعاقب یا نگرانی کرتے ہیں، جس میں اولاد کی زندگی کے ہر واقعہ کا مسلسل احاطہ کرنا شامل ہوتا ہے، اس کے بالمقابل وہ والدین جو چھپے ہوئے حرکیاتی والدین ہوتے ہیں، اس دور میں وہ زیادہ موثر ہیں؛ کیوں کہ ان کا یہ معمول ہوتا ہے کہ وہ معمولی باتوں کو نظر انداز کرتے ہیں اور سنگین نوعیت کے تربیتی مسائل کے سلسلہ میں فوری حرکت میں آجاتے ہیں، یہ اصول بچوں کی تربیت میں کارگر ثابت ہوتا ہے، جب والدین یا اساتذہ بچوں کی معمولی غلطیوں کو نظر انداز کرتے ہیں، تو اس سے بچوں کو اپنی غلطیوں پر غور کرنے کا موقع ملتا ہے اور ان کی خود احتسابی کی صلاحیت بڑھتی ہے۔

معاشرتی تعلقات کو مضبوط رکھنے کے لیے تجاہل عارفانہ ایک لازمی رویہ ہے، روزمرہ کی زندگی میں ناخوشگوار یا بار خاطر ہونے والی باتوں کا پیش آنا ایک عام بات ہے، اگر ہم ہر چھوٹی بات پر اعتراض کریں یا فوری ردعمل دیں، تو اس سے رشتے خراب ہوسکتے ہیں اور تعلقات میں دراڑیں پڑسکتی ہیں؛ اس لیے یہی طرز تغافل اختیار کرنا پڑتا ہے، امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے: "**العافية عشرة أجزاء، كلها في التغافل**" (عافیت کے دس حصے ہیں، اور وہ سب تغافل میں پوشیدہ ہیں) (شعب الإیمان، بیہقی، مکتبۃ الرشد، ممبئی، ۲۰۰۳ء، ج ۱۰، ص ۸۰۲۸) یعنی اچھے اخلاق کا زیادہ تر حصہ یہی ہے کہ چھوٹی باتوں کو نظر انداز کیا جائے، عربی شاعر نے اسی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے:

لولا التّغافُلُ عَن أشياءَ نَعرِفُها
ما طابَ عَيشٌ ولا دامت مَوَدّاتُ

یعنی اگر ہم بعض ایسی باتوں کو نظر انداز نہ کریں جنہیں ہم جانتے ہیں، تو نہ زندگی کا لطف ممکن ہے اور نہ ہی محبتیں قائم رہ سکتی ہیں۔

لیکن اگر بے خبری اور تغافل کی عادت بنالی جائے تو بسا اوقات تعلقات میں بدمزگی پیدا ہوجاتی ہے، بیخود دہلوی (و: ۱۹۵۵) نے اس رویہ کی اسی نوعیت کو ان الفاظ میں بیان کیا:

انہیں تو ستم کا مزا پڑ گیا ہے
کہاں کا تجاہل! کہاں کا تغافل!

یہاں شاعر ایک طنزیہ انداز میں معاشرتی رویہ کو پیش کرتا ہے جہاں تجاہل اور تغافل کے پردہ میں دانستہ ظلم اور حق تلفی کو عادت بنالیا جاتا ہے، اس شعر میں تجاہل عارفانہ کے مثالی رویہ کے بجائے شعوری ستم کا ذکر ہے، جو اس عمل کے کسی مفید پہلو تک رسائی کے برعکس انسانی رشتوں کو مزید پیچیدہ بناتا ہے، دانستہ طور پر کسی کو نظر انداز کرنا، اس کے مسائل سے پہلو تہی اور غفلت، اور صرف اپنے مطلب کی حد تک روابط، یہ وہ تجاہل عارفانہ ہے جو نا قابل قبول اور منفی ہے، اور اصل مسئلہ سے بے تعلقی کی دلیل ہے، مثلاً تمام تر مسائل کے لیے وقت ہو لیکن امت کے جو اہم مسائل ہیں لیکن ان کو ڈیل کرنے میں رسک زیادہ ہے، ان پر سکوت یا لاعلمی کا اظہار ہو، یا دعوت و اصلاح کی ذمہ داریوں سے غفلت کی حد تک کنارہ کشی اختیار کی جائے، یا اپنے ماتحتوں کے ساتھ انجانا سا رویہ رکھا جائے، خواہ وہ ایک ذمہ دار اور خدمت گزاروں کا مسئلہ ہو، استاد شاگرد اور امام مقتدی کا تعلق ہو یا ساس بہو کے مابین رشتہ ہو یا تعلقات کی اور جہتیں، یہ رویہ ناپسندیدہ ہے کہ:

ہر ایک بات کے یوں تو دیے جواب اس نے
جو خاص بات تھی ہر بار ہنس کے ٹال گیا

تجاہل عارفانہ نہ صرف معاشرتی تعلقات میں بہتری لاتا ہے، بلکہ یہ انسان کے ذہنی سکون اور جذباتی استحکام کا بھی ایک ذریعہ ہے، جب ہم دوسروں کی معمولی باتوں کو نظر انداز کرتے ہیں، تو ہم غیر ضروری تنازعات اور ذہنی دباؤ سے بچ جاتے ہیں، اس طرح یہ ایک حکیمانہ انداز ہے، کسی صاحب نظر کا قول مشہور ہے: "**العقل ثلثه فطنة وثلثاه تغافل**" یعنی، عقل کا ایک تہائی حصہ ذہانت میں اور دو تہائی حصہ چشم پوشی میں ہے، حقیقیت ہے کہ جو لوگ چھوٹی اور غیر ضروری باتوں کو نظر انداز کرتے ہیں وہ زیادہ متوازن اور پرسکون زندگی گزارتے ہیں، اس سے آپسی احترام و محبت میں بہتری آتی ہے، اور یہ ایمانی تقاضہ بھی ہے، ابن مبارک (و:۱۸۱ھ) فرماتے ہیں: "**المؤمن يطلب المعاذير والمنافق يطلب العثرات**" (مومن دوسروں کی غلطیوں کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ان کی طرف سے عذر ڈھونڈھتا ہے، جب کہ منافق دوسروں کی لغزشیں تلاش کرتا ہے) (إحياء علوم الدين، دار المعرفة، بيروت، ج۲، ص۱۷۷)، ایک صاحب منصب کے لیے یہ رویہ اور زیادہ ضروری ہے، عربی شاعر ابو تمام (و:۲۳۱ھ) نے کیا خوب کہا ہے:

لَيْسَ الغَبِيُّ بِسَيِّدٍ فِي قَوْمِهِ
لَكِنَّ سَيِّدَ قَوْمِهِ المُتَغَابِي

(ایک نادان شخص اپنی قوم کا رہنما نہیں ہوسکتا، البتہ وہ شخص جو دانستہ طور پر چھوٹی باتوں سے چشم پوشی کا رویہ اختیار کرتا ہے، وہی قوم کی قیادت کا اہل ہوتا ہے) (الموازنة بين شعر أبي تمام والبحتري، حسن بن بشر الآمدي، دار المعارف، ومكتبة الخانجي، ۱۹۹۴، ج۳، ص۲۴۸) اس سے صاف ظاہر ہے کہ حکمت اور بردباری سے معاملات کو سنبھالنے والا شخص ہی قوم میں عزت و مرتبہ پاتا ہے، کامیاب رہنما ہمیشہ اپنے ماتحتوں کی چھوٹی غلطیوں پر ردعمل دینے کے بجائے ان کی بڑی کامیابیوں اور کارکردگی پر توجہ دیتے ہیں اور غیر ضروری باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے مقصد پر توجہ مرکوز رکھتے ہیں، قرآن مجید بھی اس حکمت عملی کی تائید کرتا ہے، جیسا کہ سورۂ تحریم میں نبی کریم ﷺ کے بارے میں فرمایا گیا: "عَرَّفَ بَعْضَهُ وَأَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ" (التحریم:۳) یعنی نبی کریم ﷺ نے بعض باتوں کی وضاحت کی اور بعض باتوں کو نظر انداز کیا اور انہیں ٹال گئے، جب رسول اللہ ﷺ نے شہد نہ کھانے کی قسم کھائی تو حضرت حفصہؓ سے خواہش کی کہ اس کا کہیں ذکر نہ کرنا

کہ اگر یہ خبر مشہور ہوئی اور حضرت زینبؓ کو معلوم ہوئی تو ان کو تکلیف ہوگی؛ لیکن حضرت حفصہؓ نے اس کا تذکرہ حضرت عائشہؓ سے کر دیا، گویا پہلے تو ایسی تدبیر اختیار کی کہ حضور ﷺ شہد کے کھانے سے رُک جائیں اور پھر آپ نے جس بات کو راز رکھنے کا حکم دیا، اس عہد کو بھی پورا نہیں کیا؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس واقعہ سے مطلع فرما دیا، اب اگر آپ یہ ساری باتیں حضرت حفصہؓ سے بتاتے کہ تم لوگوں نے حضرت زینبؓ کے یہاں شہد پینے سے روکنے کی کیا تدبیر کی، اور پھر تم نے اس راز کو کس کے پاس فاش کر دیا؟ تو ان کو اور ندامت ہوتی؛ اس لئے تنبیہ کی غرض سے وعدہ خلافی کا ذکر فرمایا اور دوسری باتوں کو ٹال دیا، حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ظلم وستم کا کون سا رویہ ان کے ساتھ روا نہیں رکھا! یہاں تک کہ شاہی پیالہ کے معاملہ میں بنیامین کو ایک طے شدہ تدبیر کے طور پر روک لیا گیا تو بھائیوں نے حضرت یوسف کے بارے میں یہاں تک کہہ دیا کہ "إِن ?يَسرِق فَقَد سَرَقَ اَخ لَّهُ مِن قَبلُ" (یوسف: ۷۷) (اگر اس نے چوری کی تو اس سے پہلے اس کے بھائی نے بھی چوری کی تھی)، لیکن حضرت یوسف نے اسے اپنے دل میں چھپائے رکھا اور ان پر ظاہر نہیں کیا، قرآن کہتا ہے: "فَاَسَرَّهَا يُوسُفُ فِي نَفسِهِ وَلَم يُبدِهَا لَهُم" (یوسف: ۷۷)، اس طرح یہ اخلاق کریمانہ کا بھی ایک بڑا مظہر ہے کہ حضرت یوسف اتنی بڑی بات پر ضبط کر گئے اور کچھ ظاہر نہیں کیا کہ میں ہی یوسف ہوں اور یہ کتنا بڑا بہتان ہے۔

تجاہل عارفانہ سے نہ صرف رشتوں میں قربت پیدا ہوتی ہے، بلکہ اس سے ایک مثبت اور خوش گوار ماحول بھی پیدا ہوتا ہے، اس طرح کا رویہ ایک پرسکون اور تعمیری ماحول کو فروغ دیتا ہے جہاں لوگ ایک دوسرے کے ساتھ احترام اور اعتماد کے ساتھ رہ سکتے ہیں، تجاہل عارفانہ کا فائدہ سوشل میڈیا پر اٹھایا جاسکتا ہے کہ غیر ضروری کومنٹس سے گریز کرتے ہوئے اپنے روزمرہ کے اصل کاموں پر توجہ ہو، ہر اعتراض کا جواب دے کر بات کو طول نہ دی جائے، بس سمجھانے کی اپنی سی کوشش کر لی جائے، اور خصوصاً دوستوں کے معاملہ میں دار وگیر سے بچتے ہوئے آگے بڑھا جائے، اپنے دور کے امام الشعراء، پیدائشی طور پر بصارت سے محروم لیکن صاحب بصیرت شاعر بشار بن برد (و: ۱۶۸ھ) نے کہا تھا:

إِذَا كُنتَ فِي كُلِّ الأُمُورِ مُعَاتِبًا
خَلِيلَكَ لَم تَلقَ الذي لا تُعَاتِبُهُ
فَعِش وَاحِدًا أَوْ صِلْ أَخَاكَ
فَإِنَّهُ مُقَارِفُ ذَنبٍ مَرَّةً وَمُجَانِبُهُ
إِذَا أَنتَ لَم تَشرَبْ مِرَارًا عَلَى القَذَى
ظَمِئتَ وَأَيُّ النَّاسِ تَصفُو مَشَارِبُهُ

(وفیات الأعیان وأنباء أبناء الزمان، ابن خلکان، دار صادر، بیروت، ج ۱، ص ۴۲۳)

(اگر تم ہر معاملہ میں اپنے دوست سے شکوہ کرتے رہو گے تو تمہیں کبھی ایسا دوست نہیں ملے گا جس سے شکوہ نہ کرنا پڑے؛ لہٰذا، تنہا زندگی بسر کر لو یا اپنے بھائی کے ساتھ اچھی طرح نباہ لو؛ کیوں کہ وہ کبھی غلطی کرے گا اور کبھی اس سے بچا رہے گا، اگر تم گرد وغبار کے ساتھ کبھی کبھی پانی نہیں پیو گے تو تم پیاسے رہ جاؤ گے، اور کون ہے جس کا مشروب بالکل صاف ہو؟)

کوئی سچی بات اسلئے ترک نہیں کی جاسکتی کہ لوگ اس کا استقبال نہیں کریں گے۔۔ سچ سچ ہے اگرچہ تمام عالم میں اس کا ایک بھی دوست نہ ہو۔
(مولانا ابوالکلام آزادؒ)

ڈاکٹر جوھی بیگم ۔الہ آباد (یوپی)

انجام گلستاں کیا ہوگا

کووڈ کی آمد سے اب تک یعنی پچھلے چار سالوں کا جائزہ لیا جائے تو اردو ادب کی صف اول کی ہستیوں میں شامل شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر ابو الکلام قاسمی، مشرف عالم ذوقی، پروفیسر بیگ احساس، پروفسر شمیم حنفی، پروفیسر ظفر احمد صدیقی، امجد اسلام امجد، شموئل احمد، برقی اعظمی، شارب رودولوی، حسین الحق، مجتبیٰ حسین، سلام بن رزاق وغیرہ اس دار فانی کو چھوڑ گئے۔ اردو کے جواہر نایاب یکے بعد دیگرے جس طرح رخصت ہو رہے ہیں اس سے یہ احساس ہوتا ہے کہ گویا اردو ادب یتیمی کی طرف گامزن ہے۔ سترہویں صدی کے اواخر یعنی ولی دکنی کے عہد سے اب تک اردو ادب اعلیٰ پائے کے تخلیق کاروں، شعراء، محققین ونقاد سے مالا مال رہا ہے۔ موت ایک حقیقت ہے کہ لوگ دنیا سے رخصت ہوتے رہے ہیں، جب اردو ادب کے صفحۂ اول کا کوئی گوہر نایاب راہی ملک عدم ہوا دوسری صف سے نکل کر کئی جواہر ریزوں نے صف اول کے خلاء کو پر کر دیا۔ لیکن موجودہ عہد میں جب صف اول کے ستارے ڈوبتے جا رہے ہیں تو دوسری صف میں شاذ و نادر ہی ایسے لوگ نظر آتے ہیں جو اس خسارے کو پورا کر سکیں۔

ایسا نہیں ہے کہ اردو ادب بالکل ہی ویران ہو چکا ہے بلکہ اب بھی اس میں بے شمار شگفتہ گلاب و لالہ نسرین ونسترن اپنی خوشبو سے ادب کو معطر کر رہے ہیں لیکن یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا یہ کہنا مشکل ہے۔ جس طرح بڑے بڑے ادباء، شعراء ونقاد دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں اس سے لگتا ہے اردو کا سرسبز باغ خزاں کی زد میں ہے، کیوں کہ اب گلشن میں نئے شگوفے بہت کم پھوٹتے نظر آتے ہیں۔ خزاں کی اس آہٹ کو مولوی عبدالحق نے بہت پہلے محسوس کر لیا تھا۔ انھوں نے 1936 میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے اس ضمن میں اپنے خدشات کا اظہار کیا تھا، ساتھ ہی اس کے اسباب بھی بیان فرمائے تھے۔

''سرسید احمد خاں کے زمانے میں (جو جدید ادب کے بانی نہیں تو فروغ دینے والے ضرور تھے) ہمارا ادب عروج پر تھا۔ اس وقت ایسے ایسا دیب پیدا ہوئے جن کا نام ہمارے ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیگا۔ وہ زندگی کے صحیح معنی سمجھتے تھے اور دوسروں کو سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ ہم بے خبری اور غفلت کے عالم میں تھے، انھوں نے ہمیں جھنجوڑا، چونکایا، خبردار کیا اور رستے پر لگایا۔ وہ ادبی مجاہد تھے۔ وہ سر بکف میدان عمل میں اترے اور زندگی کی مشکلات سے مردانہ وار ٹکراتے اور مقابلے کرتے رہے اور اکثر پر غالب آئے۔ انھوں نے اپنے زور بیان اور قوت تحریر سے ہل چل مچادی اور سب کو ایک مرکز پر لے آئے۔ ان میں خلوص، بے غرضی، درد اور ایثار تھا۔ انھوں نے اپنے درد سے دوسروں میں سوز، اپنے خلوص اور بے غرضی سے دلوں میں جلا اور اپنے ایثار سے حب قوم پیدا کی اور ایک جماعت ایسی کھڑی کر دی جو اپنی قوم کے لیے کام کرنا شرافت اور انسانیت ہی نہیں بلکہ باعث نجات سمجھتی تھی۔ کیا اب بھی ہمارے ادب کی یہی حالت ہے؟ یہ دیکھ کر کس قدر افسوس ہوتا

ہے کہ ہمارے ادیب اور شاعر اس راستے سے ہٹتے جاتے ہیں۔ وہ زندگی کی کشمکش سے جھینپتے اور مشکلات سے کنیاتے ہیں۔ اس لیے وہ عالم خیال کی سیر کرتے رہتے ہیں اور دل فریب خوابوں سے اپنا جی بہلاتے ہیں۔ ہمیں جہاد کی ضرورت ہے اور وہ سیر وتفریح کے سامان فراہم کر رہے ہیں۔ شعروادب صرف ''حظ نفس'' کے لیے ہی نہیں ہے، اس سے اور بھی بڑے بڑے کام نکل سکتے ہیں تاکہ یہ حظ نفس کے ساتھ قوت روح بھی ہو جائے۔ ہمیں شعروادب کی ان تعریفات سے فی الحال قطع نظر کر لینا چاہیے جو فارغ البال اور عیش پرست قوموں نے کی ہیں۔ اس زمانے میں جب کہ ہم طرح طرح کی کشاکشوں میں گرفتار ہیں، ان سے آلات حرب کا کام لینا چاہیے۔ آلات حرب سے خدانخواستہ میری یہ مراد نہیں کہ ہم ملک میں فتنہ وفساد پیدا کریں۔ نہیں، بلکہ ان سے زندگی کی جنگ میں کام لینا چاہیے۔ ان کے ذریعہ سے دلوں کے ابھارنے، زندگی کے سنوارنے، شکوک کے مٹانے اور توہمات کی بیخ کنی میں مدد لیجیے۔ سید احمد خانی درد اور ایثار دکھایئے کہ بغیر اس کے کسی خیال میں گرمی اور اثر پیدا نہیں ہوسکتا۔ جس دل میں آگ نہیں وہ دوسروں میں چنگاریاں کیونکر پیدا کرسکتا ہے۔ جس دل میں لگن نہیں وہ دوسروں کو کیسے ابھار سکتا ہے۔ یہ لگن کہاں سے اور کیوں کر آئے؟ یہ اس وقت پیدا ہوگی جب آپ میدان میں آئیں گے، لوگوں کی بھیڑ میں گھسیں گے، کھوے سے کھوا چھلیگا، ہر طرف سے ٹکریں لگیں گی، مشکلات کا سامنا ہوگا۔ اس وقت آنکھیں کھلیں گی، زندگی اصلی روپ میں نظر آئیگی، اس وقت آپ کے دل پر چوٹ لگے گی اور درد اور خلوص پیدا ہوگا۔ اس وقت آپ کی صریر قلم ہولناک توپوں کی آواز سے زیادہ کارگر اور آپ کی زبان کا ایک ایک لفظ شمشیر کے گھاؤ سے زیادہ کاری ہوگا۔''

آج جب ہم اردو کی زبوں حالی کا بہ چشم سر مشاہدہ کرتے ہیں تو بابائے اردو کے دوراندیشی اور مستقبل پر نظر کی ان کی خداداد صلاحیت پر انگشت بدنداں ہوجاتے ہیں۔ اردو کے اس عظیم محسن نے 1936 میں کہہ دیا تھا کہ اب کے لوگوں میں اردو کے تئیں وہ جنون نہیں باقی رہا، اس زمین کی آبیاری کے لیے جس کی ضرورت ہے۔ وہ اپنے عہد کے ادباء، شعراء، محققین وناقدین کی خودغرضی کے شاکی، اور محض نام نمود کے لیے ادب تخلیق کرنے اور خلوص سے عاری ہونے پر دل برداشتہ تھے۔ (بابائے اردو کا یہ خطبہ rekhta.org پر دستیاب ہے۔ اردو کے لیے فکرمند اور دردمند دل رکھنے والوں کو یہ ضرور پڑھنا چاہیے۔)

آج صف اول کے جو نقاد، قلمکار، محققین اور اساتذہ ہم سے رخصت ہو رہے ہیں اور ہم اردو کا چمن ویران ہونے کے لیے فکرمند ہیں دراصل ان کی ولادت بابائے اردو کے مذکورہ خطاب کے آس پاس یا پھر دس بیس برسوں کے بعد ہوئی۔ گویا یہ حضرات ان کی تیسری علمی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جن کی شکایت مولوی عبدالحق مرحوم ومغفور نے کی تھی۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ کوئی اچانک ٹوٹ پڑنے والی افتاد نہیں ہے بلکہ یہ جذباتی، فکری، علمی اور اخلاقی انحطاط بتدریج رونما ہوا جو تقریباً ایک صدی پر محیط ہے۔ اردو زبان وادب کی خدمت کے جذبے میں کمی سے آج بات یہاں تک پہنچ گئی کہ آج اکثریت اردو کے ایسے نام نہاد خادموں کی ہے جو اردو کے نام پر عیش کوشی میں تو مصروف ہیں لیکن اردو کی بقا اور اس کے فروغ کی انھیں کوئی فکر نہیں۔ اگرچہ حکومتی اداروں کے تعاون سے اب بھی خال خال ادبی محفلیں منعقد ہو رہی ہیں، دیگر زبانوں کے مقابلے میں کم ہی سہی لیکن آج بھی پرائمری سے

لے کر اعلیٰ تعلیم تک اردو کے اساتذہ مقرر ہیں جو لاکھوں میں تنخواہیں حاصل کر رہے ہیں لیکن اردو کے فروغ کی کسی کو کوئی پرواہ نہیں ہے۔ جسے موقع مل جاتا ہے وہ خود کو اس کا مستحق اور دوسروں کو کمتر خیال کرتا ہے۔ اکثر ذمہ داری کے عہدوں پر نااہل لوگ فائز ہیں، جو باصلاحیت لوگوں کو آگے نہیں آنے دیتے، کیوں کہ انھیں اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی باصلاحیت فرد کران کے اطراف میں پہنچ جائے گا تو اس سے ان کی قلعی کھل جائے گی، یہی نہیں اس سے ان کی اہمیت بھی کم ہو جائے گی۔

ایک سوال ذہن میں خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ نااہل لوگ ایسے مقام پر کیسے پہنچ جاتے ہیں؟ تو جناب! جواب اس کا یہ ہے کہ یہ جو تیسری نسل کے باہنر اور باصلاحیت لوگ جن کے رخصت ہونے پر ہم رنجیدہ ہیں، اور جن کے جانے سے ہمیں چمنستان اردو ویران ہوتا نظر آ رہا ہے، ان نااہلوں کو ذمہ داریاں سونپنے کے ذمہ دار اکثر یہی لوگ ہیں۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے اقرباء پروری، خوشامد پسندی، خودغرضی یا پھر ذاتی انا کے سبب نہ جانے کتنے باصلاحیت لوگوں کو زندہ درگور کر دیا۔ میں ایسے ایک نہیں کئی خواتین وحضرات کو ذاتی طور پر جانتی ہوں جنھیں عام اردو الفاظ کے تلفظ بھی نہیں معلوم۔ مثبت کو مَثبت، منفی کو مُنفی، خفت کو خَفت، آورد کو آوُرد اور سمت کو سِمت پڑھنے والوں کو کیا یونیورسٹیوں اور کالجوں میں پڑھانے کا حق حاصل ہے؟ اگر یہ نئی نسل کو تعلیم دیں گے تو سمجھا جا سکتا ہے آئندہ نسل کی اردو کا کیا حال ہونے والا ہے؟ میرے اپنے ایام طالب علمی میں الہ آباد یونیورسٹی میں ایسے اساتذہ بھی موجود تھے جن کا طریقۂ تدریس اور لیکچرس ذہین طلباء و طالبات کو سمجھ میں نہیں آتا تھا چہ جائکہ کمزور طلبہ۔ وہیں اس وقت ایسے اساتذہ بھی موجود تھے جن کے دیے ہوئے دروس آج بھی ازبر ہیں۔ آج اکثر اعلیٰ تعلیمی اداروں میں اول الذکر اساتذہ کی کثرت ہے۔ پرائمری اور سیکنڈری درجات کا تعلیمی معیار انتہائی پست ہو چکا ہے۔ اکثر اردو کے اساتذہ کو اردو کے فروغ کی کوئی پرواہ نہیں۔ تعلیمی معیار کے کا یہ عالم ہے کہ درجہ دوازدہم پاس کر کے آنے والی طالبات نامانوس الفاظ تو کجا روزمرّہ استعمال میں آنے والے الفاظ کا املا درست نہیں لکھ پاتیں۔ جب اردو کا تعلیمی معیار اس قدر پست ہو تو اردو کی بقا کی بات کرنا بھی بے معنی سا لگتا ہے۔

تحقیق کے نام پر آج سرقہ کو فروغ حاصل ہو رہا ہے، تحقیقی مقالوں کا معیار لگاتار گرتا جا رہا ہے، اب نگراں کو بس ایک اور مقالہ جمع کروا کر اور اپنے اثر ورسوخ کے ذریعے اس پر ڈگری تفویض کروا کر اپنے نام کے ساتھ ایک اور تھیسس لکھانے کا تمغہ حاصل کرنے سے غرض ہے۔ اس کو اس سے کوئی سروکار نہیں کہ اردو کو کیا کچھ حاصل ہونے والا ہے؟ مقالہ نگار کو بھی اس سے کوئی غرض نہیں کہ اس نے جو مقالہ تحریر کیا ہے اس کی ادبی حیثیت کیا ہے؟ اسے تو بس اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھنے کا شوق ہے، جسے پورا کرنے کے لیے وہ پستی کے کسی بھی گڑھے میں گرنے کو تیار ہے۔ صرف اردو ہی نہیں دیگر مضامین میں بھی پیسے دے کر تھیسس لکھوانے کا رواج بڑھتا جا رہا ہے۔ جب تحقیق کا معیار یہ ہوگا تو اردو کے فروغ کے سبز باغ دیکھنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟

تخلیقی ادب کے تعلق سے جب اردو کے ادبی منظر نامے پر غور کرتے ہیں تو یہ انتہائی سطحی نظر آتا ہے۔ اگرچہ خال خال معیاری تخلیقات بھی سامنے آتی ہیں تاہم یہ اکثر اردو کے انہی 'درنایاب' کی ہوتی ہیں جن کے بچھڑ جانے کا ڈر ہر وقت بنا ہوا ہے۔ نئے قلم کاروں کی معیاری تخلیق اب

تقریباً ناپید ہے۔ شاعری کے میدان میں مشاعروں میں غزل کے نام پر اکثر تک بندی اور گلے بازی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ جس پر سامعین کی واہ واہ سٹیوں اور ہنگامے سے سامعین کے معیار کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مشاعروں میں اب شاذونادر ہی معیاری کلام سننے کو ملتا ہے اور اگر کوئی معیاری کلام پڑھا بھی جائے تو اس کو سامعین کی سرد مہری شاعر کو دل برداشتہ کر دیتی ہے۔ ایسے شعراء داد وتحسین سے محروم رہ جاتے ہیں جو کلام تو اچھا کہتے ہیں لیکن دلکش اداؤں اور خوبصورت آواز سے سامعین کو محظوظ نہیں کر پاتے۔ نثری تخلیقات جو 'معیاری' ادبی رسائل کی زینت بنتی ہیں ان میں سے بھی اکثر اپنی طرف راغب کر پانے سے قاصر ہیں۔ 'نامی گرامی' رسائل میں کوئی تحریر شائع کروانے کے لیے یا تو آپ خود کسی عہدے پر فائز ہوں یا پھر ''اردو کے زعماء'' میں سے کسی کی سفارش ضروری ہے۔ عصری تخلیقات کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اکثر تخلیق کار عدم مطالعہ کے مرض کا شکار ہیں یہ سیکھنے سے پہلے سکھانے کے متمنی ہیں۔

ایک وقت تھا جب اردو کے فروغ کی باتیں ہوتی تھیں لیکن آج اردو کی بقاء کا سوال ہے۔ ہندوستان میں جہاں حکومتی سطح پر اردو کو کسی طرح کا تحفظ نہیں مل رہا ہے، اردو کا روزگار سے تعلق منقطع ہوگیا ہے، اردو کو ایک خاص طبقے کی زبان سمجھ کر اس کے ساتھ متعصّبانہ برتاؤ کیا جارہا ہے، ایسے میں محبان اردو کی ذمہ داری تھی کہ وہ اس کو سنبھالتے اور اس کے فروغ کی کوشش کرتے لیکن انتہائی افسوس ناک امر ہے کہ اردو کی روٹی کھانے والے اپنے بچوں کو اردو پڑھانے کے حق میں نہیں ہیں۔ عوام الناس اپنے بچوں کو اردو اس لیے نہیں پڑھاتے کہ اس میں روزگار کے مواقع بہت مختصر ہیں۔ آزادی کے بعد مسلمانوں سے جو سب سے بڑا دھوکہ ہوا وہ یہ تھا کہ 'تعلیم حاصل کر کے کیا کروگے؟ نوکری تو ملنی نہیں ہے'۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک پوری نسل جہل کے اندھیرے میں زندگی گزار کر رخصت ہوگئی۔ بعض مخلصین ملت کی کاوشوں سے اب مسلمان حصول علم کے لئے بیدار تو ہوا ہے لیکن اب اسے یہ کہہ کر گمراہ کیا جارہا ہے کہ 'اردو پڑھ کر کیا کروگے؟ اس میں روزگار کے مواقع نہیں ہیں'۔ میں کہتی ہوں کہ کیا جو کچھ آپ نے اسکول کالج میں پڑھا ہے وہ سب آپ کی معاشی ضروریات پوری کرنے میں معاون ہیں؟ بی ایس سی کر کے بینک میں ملازمت کرلی تو سائنس کی تعلیم آپ کی نوکری میں کیا مدد کر رہی ہے؟ بی ٹیک کر کے انشیورنس ایجنٹ بن گئے تو فزکس کی تعلیم آپ کے کس کام آئی؟ ایسی بہت ساری مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ تعلیم آپ کے ذہن کے بند دریچوں کو وا کرتی ہے، جینے کا سلیقہ سکھاتی ہے، اپنے فیصلے لینے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے، اور ان سب سے بڑھ کر آپ کو مہذب بناتی ہے۔ اور ان سب کے لیے میں نہیں سمجھتی کہ اردو سے بہتر کوئی اور مضمون ہوسکتا ہے۔ اس لیے میری تمام والدین سے دردمندانہ اپیل ہے کہ اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم ضرور دیں۔ یہ نہ صرف آپ کے بچوں کی دنیا سنوارنے کی صلاحیت رکھتی ہے بلکہ اس کے ذریعے آخرت میں بھی کامیاب ہوسکتے ہیں، کیوں کہ اردو میں دین اسلام سے متعلق بیش بہا خزانہ دستیاب ہے۔ اردو کے دانشوران سے بھی میری التجا ہے کہ اب تک اردو کو بہت نقصان پہنچ چکا ہے خدارا اب بیدار ہوجائیں اور خلوص دل و نیک نیتی کے ساتھ اردو کی بقا کے لیے ازسرنو کوشش کریں، ورنہ روز آخرت آپ کو اس امانت میں خیانت کا حساب دینا پڑسکتا ہے۔

محمد شاھد الاعظمی۔ایم اے اردو سال دوم،شبلی نیشنل کالج،اعظم گڑھ

علی گڑھ تحریک کی علمی وادبی خدمات

اردو زبان وادب کے فروغ اور ترقی میں مختلف دبستانوں اور تحریکوں کا کردار اہم رہا ہے، ان دبستانوں اور تحریکوں کے زیر اثر اردو ادب میں بہت کچھ ترقیات ہوئیں، اردو کی ابتدائی تحریکوں میں علی گڑھ ایک نمایاں تحریک ہے۔

علی گڑھ تحریک ایک ادبی تحریک تھی جس کے زیر سایہ اردو ادب میں ایک انقلاب آفرین تغیر رونما ہوا، اس تحریک نے اردو زبان میں سادگی، فصاحت و بلاغت، مٹھاس، گہرائی، وسعت اور توانائی پیدا کی اور اردو زبان کو دنیا کی مہذب زبانوں کی صف میں کھڑی ہونے کے قابل بنایا۔

علی گڑھ تحریک کا بیج 1857 کے غدر سے پھوٹا، 1857 سے قبل سیاسی، سماجی، اقتصادی اور مذہبی حالات کو بہت بہتر نہیں کہا جا سکتا ہے، کیونکہ انیسویں صدی کے اوائل میں مغلیہ سلطنت برائے نام رہ گئی تھی۔ 1857 کی جنگ آزادی میں مغلیہ سلطنت کے آخری فرماں روا بہادر شاہ ظفر کو شکست سے دوچار ہونا پڑا اور مکمل طور سے مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

اس جنگ آزادی میں مسلمانوں نے سب سے زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اس لیے انگریزوں نے سب سے زیادہ مسلمانوں کے اوپر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے مسلمانوں کی جائیداد واملاک کو تہس نہس کر دیا، ان پر روزی روزگار کے تمام مسدود کرا دیئے گئے، مسلمان زمینداروں اور قوم کی با اثر شخصیات کی عزت کو نیلام کیا گیا، اس طرح مسلمانوں کے اندر معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی ہر اعتبار سے بدحالی پیدا ہو گئی۔

1857ء کی ناکامی کے بعد ہندوستان میں مختلف سطحوں پر ہندوستانی مسلمانوں کے لیے کوششیں ہوئیں، تاکہ ان کی مذہبی، دینی، ملی، قومی، سماجی، تعلیمی اور اقتصادی رہنمائی کی جا سکے، ان کے غموں اور دردوں کا مداوا کیا جا سکے، اس ضمن میں کئی ایک مذہبی تحریکات نے بھی جنم لیا اور مسلمانان ہند کی رہنمائی ورہبری کا فریضہ انجام دیا۔

سرسید احمد خان نے 1857 کی تباہی اور بربادی اور ظلم وستم کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اس نازک دور نے سر سید کو ذہنی الجھن اور عجیب پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا، انہیں ہندوستانی مسلمانوں کے فلاح و بہبود کی فکر دامن گیر ہوئی اور مسلمانوں کی فلاح کے لیے سخت سے سخت کام کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا اور وہ اپنے اس عظیم مقصد میں بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے۔

سرسید علوم جدیدہ سے واقفیت کو ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اہم ترین ضرورت سمجھتے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ اردو شعر و ادب میں بھی اٹھارہویں صدی کے انگریزی شعر و ادب کی طرح افادی، مقصدی اور تعمیری ہو، جس کے لیے ضروری تھا کہ انگریزی علوم وفنون اور ادب سے واقفیت حاصل کی جائے، اس لیے انہوں نے سب سے پہلے ایک انگریزی اسکول اور سائنٹیفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی جو بعد میں علی گڑھ میں منتقل ہو گئی۔ سرسید نے مغربی تعلیمی اداروں کا مطالعہ کرنے کی غرض سے لندن کا سفر کیا اور وہاں سے واپسی

پر رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کرنے کا منصوبہ بنایا، ساتھ ہی ساتھ انہوں نے محمڈن ایجوکیشنل سوسائٹی کی بنیاد رکھی جو بعد میں چل کر محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ہوگئی، تاکہ اس کے ذریعے تمام ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی مسائل کو حل کرنے میں مدد دی جاسکے، جس نے بہت مفید کام کیے اور جگہ جگہ تعلیم گاہیں قائم کی، اس ساری جد و جہد کے لیے انہوں نے اردو شعر و ادب میں بھی دوررس تبدیلیوں کا مطالبہ کیا تاکہ مسلمانوں کی تہذیبی، سماجی، مذہبی، تعلیمی اور ادبی زندگی نئے حالات اور نئے چیلنجوں کا مقابلہ کرسکے اور اس کی مردہ رگوں میں زندگی کا گرم لہو حرکت کرسکے۔

علی گڑھ تحریک نے ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی خدمات کا بھی بیڑہ اٹھایا، اس تحریک نے مذہب کی صداقت کے لیے عقل انسانی اور قانون فطرت کو معیار قرار دیا، مسلمانوں کے مذہبی عقائد کو پختگی دینے کی کوشش کی، اس لحاظ سے اس تحریک نے اسلام کے داخلی اور خارجی خطروں کو تحفظ بخشا اور ہندوستانی رسومات اور توہمات کے منفی اثرات کو زائل کیا، گرچہ کچھ مواقع ایسے بھی ہیں جہاں سرسید تحریک کی وجہ سے مذہبی اقدار پر بھی آنچ آئی، اس کی بنیادی وجہ عقل کا دائرہ سے زیادہ استعمال تھا، جس پر مذہبی علماء کی طرف سے تنقیدیں بھی کی گئیں۔

سرسید کی اس تحریک کا ادبی زاویہ نہایت فعال تھا، اور دراصل اس تحریک کا لب لباب بھی یہی ہے، اس کے تحت نہ صرف زبان کو وسعت ملی بلکہ اردو ادب نئے اسالیب بیان سے آشنا بھی ہوا۔

علی گڑھ نے سائنسی نقطۂ نظر اور اظہار کی صداقت کو اہمیت دی، ادبی زاویے میں اس تحریک کا سب سے بڑا اثر سوانح نگاری اور سیرت نگاری پر پڑا، اس تحریک کے زیر اثر سرسید نے آثار الصنادید، رسالہ اسباب بغاوت ہند، دلائل محمڈن آف انڈیا جیسی کتب لکھیں۔ سرسید کو اس تحریک میں جو رفقاء ملے وہ انتہائی باصلاحیت ذہین و فطین تھے ان میں تصنیفی و تالیفی صلاحیتیں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔

علی گڑھ تحریک سے منسلک سرسید کے رفقاء میں علامہ شبلی نعمانی، وقار الملک، نواب محسن الملک، مولوی چراغ علی، خواجہ الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد، عبدالحلیم شرر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی نے سیرت کو اپنا موضوع بنایا، اور سیرت النبی، الفاروق اور المامون جیسی کتب لکھیں۔

وقار الملک نے رسالہ تہذیب الاخلاق میں قومی، معاشرتی، مذہبی اور اخلاقی موضوعات پر متعدد مضامین لکھے۔

اسی طرح محسن الملک تہذیب الاخلاق کے اہم مضمون نگار تھے، مضمون نگار کی حیثیت سے وہ ایسے مفکر کے روپ میں ابھرے جس نے ادب اور زندگی کے جمود کو توڑنے اور صالح روایات کو فروغ دینے میں اہم کردار نبھایا۔

مولوی چراغ علی کا بنیادی موضوع مذہب تھا انہوں نے اسلام کے خلاف اعتراضات کرنے والوں کے لیے دفاعی مورچہ کھولا اور اپنے ٹھوس دلائل کے ساتھ ان معترضین کا دندان شکن جواب دیا۔

الطاف حسین حالی نے اس تحریک کے زیر اثر تریاق مسموم تحریر کی اور اردو میں سوانح نگاری کی بنیاد رکھی آپ نے مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر جدید شاعری کو تنقیدی اساس بھی مہیا کیا، مولوی نذیر احمد اور عبدالحلیم شرر جیسے ناول نگار بھی اردو ادب میں ایک بیش بہا بیش قیمت اضافہ تھے، ان دونوں

حضرات نے اردو میں تاریخی ناول نگاری کی بنیاد رکھ کر مسلمانوں کو ان کی تاریخی اسلاف سے متعارف کروایا۔

سرسید اور ان کے مذکورہ بالا تمام رفقاء کار نے اپنی تحریروں میں مذہبی، سیاسی، اخلاقی اور معاشرتی اصلاح پر زور دیا۔ مولانا حالی کی ''مسدس حالی'' مولانا شبلی نعمانی کی ''سیرت النبیؐ'' اپنی مثال آپ ہیں۔ اس تحریک کی وجہ سے اردو ادب میں نیا ادبی شعور، شاعری میں نیا رجحان اور ناول کا آغاز ہوا اور اسی دور میں ادبی تنقید کو رواج دیا گیا۔ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

''حالی نے مقدمہ شعر و شاعری (۱۸۹۳ء) لکھ کر با قاعدہ تنقید نگاری کی داغ بیل ڈالی، ان کے ساتھ اس سلسلہ میں شبلی کا نام بھی لیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ان دونوں نے سوانح عمریاں لکھ کر اردو کو نئی روش سے آشنا کیا۔ ادھر شبلی نے تاریخ میں جو کام کیا وہ آج بھی سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ نذیر احمد نے ناول نویسی کا آغاز کیا۔ محمد حسین آزاد جدید نظم کو متعارف کرانے کا باعث بنے۔ المختصر سرسید تحریک کے بلا واسطہ یا بالواسطہ اثرات کا ثمرہ اس ذہنی نشاۃ الثانیہ کی صورت میں ظاہر ہوا جس نے اردو ادب کو تنگنائے غزل سے باہر نکالا۔ اسے زندگی کا ترجمان بنا کر اس کی پیچیدگیوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت بھی پیدا کی اور یوں وہ اردو و نثر جس میں ایک بھی درخور اعتنا تصنیف نہ تھی، ربع صدی کے قلیل عرصہ میں علمی و ادبی مضامین سے مالا مال ہوگئی''۔

مجموعی طور پر علی گڑھ تحریک اردو ادب کی اولین فکری تحریک تھی جس نے نثری اصناف کو فروغ دیا اور قوم کو پسماندگی سے ترقی کی جانب مائل بھی کیا۔

سید جہانگیر بیابانی۔ چنئی، تاملناڈو

سلام برسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

السلام علیک السلام علیک یا شفیع الورا
السلام علیک السلام علیک یا ربُّ العلی

السلام علیک السلام علیک یا سر انبیاء
السلام علیک السلام علیک یا محبِّ خدا

السلام علیک السلام علیک یا ھادیٔ دوسرا
السلام علیک السلام علیک یا رسولِ خدا

السلام علیک السلام علیک یا حبیبِ خدا
السلام علیک السلام علیک یا سرورِ انبیاءؐ

السلام علیک السلام علیک یا شہ انبیاء
السلام علیک السلام علیک یا خاتم الانبیاء

السلام علیک السلام علیک یا نورِ زماں
السلام علیک السلام علیک یا حکیم زماں

السلام علیک السلام علیک یا خیر خواہِ یتیم
السلام علیک السلام علیک یا غرباء کے منیم

السلام علیک السلام علیک یا امیر المؤمنین
السلام علیک السلام علیک یا ضرور المسلمین

فائزہ عظیم احمد۔ایم اے،شبلی کالج،اعظم گڑھ

تعلیم کے فروغ میں علامہ شبلی نعمانی کا کردار

علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء-۱۹۱۴ء) دقیق النظر عالم، عمدہ مصنف، بے مثال مورخ اور تجربہ کار مفکر تھے، علمی اور فنی کمالات کے ساتھ ساتھ وہ مسلمانوں کی اصلاح و ترقی اور بلندی و سرفرازی کے لئے فکرمند بھی تھے، ان کی علمی جدوجہد اور قومی خدمات اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ وہ مسمانوں کی تعلیم کو حد سے زیادہ ضروری سمجھتے تھے؛ کیوں کہ تعلیم ہر قوم کی عظمت رفتہ کا بہترین ذریعہ ہے۔ محض تعلیم ہی ایسی شئے ہے جس سے لوگوں کے عادات و خصائل مرتب ہوتے ہیں اور ترقی کی راہیں ہموار ہوتی ہیں؛ یہی وجہ ہے کہ علامہ شبلی نے تعلیم کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

شبلی اسکول

۱۸۸۳ء کو اعظم گڑھ میں نیشنل اسکول قائم کیا جو کہ آج ایک عظیم کالج بن گیا ہے، اس اسکول کو وہ اپنی فکر کے مطابق ترقی دینا چاہتے تھے، انگریزی تعلیم کو قوم کی ترقی کے لئے بے حد ضروری خیال کرنے کے باوجود بھی علامہ انگریزیت سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ علی گڑھ کالج پر جہاں مشرق و مغرب کے اساتذہ یکجا تھے اور مغربی علم کا بولا بالا تھا اپنے اثرات قائم کئے بقول سید صاحب علی گڑھ جہاں جہاں مغربی علوم وفنون کا غلبہ تھا، علامہ اس سے متاثر نہیں ہوئے؛ بلکہ اسلامی علوم وفنون کی اہمیت اس طرح اجاگر کی کہ بعض پروفیسر کے اندر اس کے حصول کی تمنا جاگ گئی۔(۱)

اس اسکول کی بنیاد کچھ ایسی نیک ساعت میں ڈالی کہ آج یہ ترقی کر کے پوسٹ گریجویٹ کالج بن گیا ہے اور اپنی ناقابل فراموش خدمات انجام دے رہا ہے نیشنل کے ساتھ ہی آپ نے اپنے گاؤں بندول میں بھی ایک دینی درسگاہ قائم کی تھی، اس کے علاوہ آعظم گڑھ میں شبلی نے ''مجلس موازنہ ترقی قومی'' قائم کی اور مولوی سمیع صاحب کو اس کا سکریٹری منتخب کیا(۲) اس کا مقصد آعظم گڑھ کے مسلمانوں کی تعلیمی حیثیت کا جائزہ لے کر صورت حال سامنے لانا، اور تعلیمی ترقی کے منصوبے بنانا تھا، چنانچہ اس کے متعدد جلسے ہوئے اور اس کی رودادیں بھی شائع کی گئیں۔

تعلیمی نظریات

شبلی ادیب، مورخ اور نقاد کے ساتھ ایک عظیم ماہر تعلیم بھی تھے، یہی وجہ ہے کہ عملی وفکری طور پر شبلی نے تعلیم کے میدان میں اہم خدمات انجام دی۔ شبلی ایسی تعلیم کے خواہاں تھے جو قدیم وجدید دونوں کی جامع ہو، ان کے نزدیک تعلیمی مسئلہ کے حل کی یہی ایک صورت تھی ایک موقع پر فرماتے ہیں کہ ''ہم مسلمانوں کے لئے نہ صرف انگریزی تعلیم کافی ہے نہ قدیم تعلیم، ہمارے درد کا علاج ایک معجون مرکب ہے جس کا ایک جز مشرقی دوسرا مغربی ہے''(۳)

شبلی کی فکر تھی کہ علماء انگریزی علوم وفنون کے ذریعہ دیگر قوموں کو ان کی زبان میں جواب دیں، ان کے یہاں جتنی اہمیت جدید تعلیم کی تھی اتنی ہی قدیم کی، اپنی یہ بنیادی فکر انہوں نے 'مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم' میں پیش کی، جس نے

بقول سلیمان ندوی ''عربی مدرسوں میں اصلاح کا خیال پیدا کردیا'' (۴)

یہ مضمون نہ صرف علوم وفنون کی اشاعت اور تعلیم کے فروغ کے بارے میں مسلمانوں کو ماضی سے جوڑتا ہے؛ بلکہ اہم موضوعات پر عصری اسلوب کے مطابق تصنیف وتالیف کا سلیقہ بھی سکھاتا ہے۔

تحریک ندوۃ

شبلی تحریک ندوۃ میں پیش پیش تھے، تحریک کا اولین اور بنیادی مقصد نصاب اور طریقہ تعلیم کی اصلاح تھا، شبلی مدارس کو حفاظت و اشاعت اسلام کا مرکز بنانا چاہتے تھے، ایک ایسے نصاب کے لیے سرگرم عمل تھے جس میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی، سنسکرت اور جدید سائنس کی باقاعدہ تعلیم شامل ہو، عہد شبلی میں درس نظامی میں بعض وہ کتابیں تھیں جو نئے چیلنجز کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھیں، بلکہ ترمیم شدہ نصاب ہی نئے چیلنجز کا مقابلہ کرسکتا تھا۔ اسی لیے شبلی نے نصاب تعلیم پر نہ صرف زور دیا بلکہ ایسا نصاب بھی تیار کیا جو زمانہ کی ضرورتوں کے عین مطابق تھا۔

ان سب میں علامہ کو بڑی دقتوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، ندوہ میں آپ کے مخالفین کا ایک مکمل گروہ تیار ہوگیا تھا جن کے بارے میں ڈاکٹر الیاس اعظمی رقم طراز ہیں:

''ان کے ہر کام میں کیڑے نکالتا اور طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کرتا رہا، مگر خدا جانے وہ شخص (شبلی) کس شخص کا بنا ہوا تھا کہ باوجود ان تمام الجھنوں اور دشواریوں کے اپنے کاموں میں مسلسل مصروف اور سرگرم عمل رہا اور ہندوستان کے مسلمانوں کو ندوہ کی شکل میں علم کا ایک ایسا تاج محل عطا کیا، جس کا تصور آج بھی محال ہے (۵)

ندوہ تو آج بھی زندہ ہے اور تا قیامت رہے گا۔ ان شاء اللہ مگر تحریک ندوہ جس کا خواب دیکھا گیا تھا وہ کب کا بجھ گئی شبلی جیسا غیر معمولی شخص ندوہ کو دوبارہ نصیب ہی نہیں ہوا شبلی کی علاحدگی پر افسوس کرتے ہوئے مولانا ضیاء الحسن علوی ندوی نے لکھا ہے کہ ''لوگوں کو معلوم نہیں کہ ندوہ نے کیسی دولت گنوائی''

نصاب کا اجراء

اس نصاب میں عربی ادب، فن بلاغت، اروتنقید کے علاوہ علوم اسلامیہ تفسیر، علوم قرآن، عقائد وفلسفہ اور اسرار شریعت سے متعلق بعض نئی کتابیں شامل کی گئی مزید برآں جدید علوم میں انگریزی اور جدید فلسفہ وسائنس کی کتابیں نصاب میں رکھی گئی (۶)

ندوہ میں تعلیمی خدمات

علامہ شبلی ندوہ کے معتمد تعلیم تھے، ندوہ کی تعلیمی ترقی میں آپ نے کلیدی کردار ادا کیا، ندوہ میں آپ نے قرآن بھی پڑھایا ہے اور، حدیث شریف بھی یہی نہیں بلکہ آپ نے ملک کے ممتاز علماء فضلاء اور دانش وروں کو بلا کر ندوہ میں تعلیم کا معیار بلند کرنے کی کوشش کی ہے علامہ حمید الدین فراہی کو اکثر ندوہ بلاتے جو قرآن کا درس دیتے پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب سالانہ جلسہ ندوہ میں ہندوستان کے ممتاز علماء کے ساتھ مصر کے نامور عالم ومفسر شیخ رشید رضا ایڈیٹر المنار کو بلا کر صدارت کرائی اسی جلسے میں مولانا سید سلیمان ندوی نے عربی میں تقریر پیش کی تھی یہ پہلا موقع تھا کہ آپ نے ندوہ کا رشتہ عالم عربی سے قائم کیا اور ندوہ کی آواز عالم عرب میں گونجی۔ (۷)

آپ نہ صرف یہاں درس دیتے تھے بلکہ اساتذہ کو بھی

طریقہ تدریس کے ہنر سمجھاتے اور قدیم طرز تعلم کے بجائے انہیں جدید طریقہ تعلیم اختیار کرنے پر زور دیتے، آپ نے آٹھ برس کی عربی تعلیم کے بعد دو برس خالص انگریزی تعلیم کا خاکہ بنایا تا کہ عربی علوم کی تکمیل کے بعد طلبہ انگریزی زبان دانی میں گریجویٹوں کی برابری کرسکیں اور انگریزی میں تبلیغ کی خدمت انجام دیں، اس کے علاوہ ندوہ میں ہندی اور سنسکرت کی تعلیم کے لئے ایک پنڈٹ کا تقرر کیا اور جدید طبیعات اور جدید ہئیت کی کتابیں شامل درس کی (۸)، درسیات میں ان اضافوں کے ساتھ دارالعلوم میں جو دیگر تعلیمی ترقیاں شبلی کی کوششوں سے ہوئی۔ان میں جدید عربی کی تعلیم اور اس میں تحریر وتقریر کی مشق، جدید عربی ڈکشنری کہ تیاری، علمی موضوعات پر بولنے ولکھنے کی تربیت، اور ایک اعلی درجے کے کتب خانہ کا قیام وغیرہ شامل ہے۔

رسالہ الندوہ

الندوہ کا اجراء شبلی کا ایک اہم کارنامہ ہے، جس نے مسلمانوں میں علمی بیداری پیدا کی۔الندوہ کے علماء پر گہرے اثرات تھے، الندوہ میں جہاں نئے مباحث پر خامہ فرسائی ہوئی، وہیں مستشرقین کے اعتراضات کا دنداں شکن جواب بھی دیا گیا، آپ نے اس الندوہ کی نو برس ادارت کی اور اپنی کوشش تحریروں اور تلامذہ کے تعاون سے اسے ایک ایسا رسالہ بنادیا جس نے تاریکی میں روشنی کا کام کیا اور بے شمار لوگ اس سے مستفید ہوئے، یہی نہیں تصنیف وتعلیم کے علاوہ آپ کا ایک عظیم کارنامہ یہ بھی ہے یہاں سے آپ نے طلبائے ندوہ کی تربیت کی، اور یہیں سے مولانا ابوالکلام آزاد جیسے مایہ ناز قلمکاروں پروان چڑھایا۔

ریاست بھوپال کے مدارس کی اصلاح وتنظیم کا خاکہ

مسلمانوں کی ذہنی فکری اور تعلیمی ترقی کے لئے شبلی کی دائرہ صرف ندوہ تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ آپ نے بھوپال کی تعلیمی مجس شوری ''نظارۃ المعارف'' کے تحت بھوپال کے مدارس کی اصلاح وتنظیم کے کام میں مدد دی اور اس کے نصاب کا خاکہ پیش کیا جس کے بارے میں سید صاحب لکھتے ہیں کہ:

''ہندوستان کے عربی مدارس کی اصلاح کا یہ سب سے پہلا اور تاریخی نقشہ ہے۔''(۹)

درجہ ششم تک کے اس نصاب میں صرف ونحو، زبان وادب، انشاء تاریخ، حدیث، فقہ، عقائد، اور منطق وفلسفہ کے علاوہ ہر درجہ میں ایک گھنٹہ کا حساب رکھا گیا ہے اور حساب کے کورس میں شبلی نے وہی کتابیں تجویز کی ہیں جو اس وقت علی گڑھ میں رائج تھیں اس کے علاوہ عربی وفارسی کے نصاب میں بہت سی اصطلاحات کی ہیں، اور طریقہ درس بتایا جس کے خوشگوار نتائج برآمد ہوئے۔

دارالمصنفین

شبلی کے خاکوں پر قائم کردہ دارالمصنفین درحقیقت شبلی کے تعلیمی منصوبوں میں سے ایک تھا جسے وہ ندوہ میں قائم کرنا چاہتے تھے، جس کا مقصد زمانے سے ہم آہنگ مصنفین کو پیدا کرنا تھا، تا کہ اس سے علوم اور تاریخ اسلام کا احیاء ہو، اس مقصد سے ان کی خواہش تھی کہ ایک ایسا کتب خانہ قائم کیا جائے کہ جس میں بیش بہا تصانیف موجود ہوں اور اہل قلم اس سے پورا فائدہ اٹھائیں، اور جس طرح یورپ میں اکیڈمیاں ہوتی ہیں اسی طرح اس کتب خانہ کے ساتھ ایک اکیڈمی بھی ہو جس کے ارکان کا کام صرف مطالعہ کتب اور تصنیف و تالیف ہو، دراصل دارالمصنفین کے قیام کا مقصد اور اس کی غرض، وغایت درحقیقت مولانا کے تعلیمی فکر کے مطابق ایسے افراد کی تیاری تھی، جو نئے زمانہ میں نئے حالات کا علمی سطح پر

سامنا کر سکے، اور مسلمانوں کی علوم وفنون کی نادر کتابوں کی تصحیح تحشیہ اور تراجم واشاعت میں دلچسپی لیں تاکہ اس سے علوم اور تاریخی اسلام کا احیاء ہو اور ان کی یہ خواہش دارالمصنفین کی صورت میں پوری ہوئی، دارالمصنفین کی تاریخی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے یہ صرف علاقائی ادارہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک عالمی ادارہ ہے۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

اس کا قیام ۲۷ر دسمبر ۱۸۸۶ء عمل میں آیا اس کا مقصد ملک کے باشندوں میں علمی بیداری اور اپنے تہذیبی ورثہ کے تحفظ کو یقینی بنانا تھا یہ کسی خاص خطہ تک محدود نہیں تھی بلکہ تعلیمی بیداری کے لیے یہ کانفرنس ہندوستان کے متعدد علاقوں میں منعقد ہوئی، اگرچہ اس کے قیام کا سہرا سرسید کے سر جاتا ہے، لیکن اس تحریک کو تاب وتوانائی بخشنے میں سرسید کے رفقاء بالخصوص شبلی نعمانی کی کاوشوں کا بڑا ہاتھ ہے، شبلی کی فکر انگیز تقریروں، تحریروں، قومی منظومات وقصائد سے کانفرنس کو نئی زندگی ملی، اور یہ مسلمانوں کی ذہنی آبیاری اور تعلیمی بیداری کا فریضہ انجام دیتی رہی، ملازمت سے علاحدگی کے پانچ سال بعد مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے انہیں اپنے ایک شعبہ انجمن ترقی اردو کا سکریٹری نامزد کیا۔

(۱۰) جس پر وہ تین برس تک فائز رہے اور اردو کی ترقی کے متعدد منصوبے بنائے، اہل علم اور ادباء شعرا سے خط وکتابت کی دستور العمل بنایا، اس کے حساب کتاب کا نام وضبط کیا، عربی فارسی اور انگریزی سے ترجمہ کے لئے متعدد کتابوں کا انتخاب کیا، بعد ازاں مولوی عبدالحق صاحب نے علامہ شبلی کے ہی لگائے شجر پر انجمن میں نئے برگ وبار پیدا کئے، مختصر یہ کہ اس انجمن کو انجمن بنانے میں شبلی کا بڑا ہاتھ ہے۔

مدرسۃ الاصلاح

ندوہ سے علیحدگی کے بعد علامہ شبلی اصلاح کی تعلیمی ترقی کی طرف متوجہ ہوئے، جسے اگرچہ مولوی محمد شفیع صاحب نے قائم کیا تھا، شبلی نے انہیں کی خواہش پر اس کے جلسوں میں شرکت کی، پھر معتمد تعلیم کا عہدہ سنبھالا اور مفید مشوروں سے نوازا، جب آپ ۱۹۱۲ء میں دارالعلوم کی معتمدی سے سبکدوش ہوئے تو دارالمصنفین اور مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کو ملا کر ایک اچھا خاصے جامعہ اسلامیہ کا تصور شبلی کے ذہن میں آیا۔ (۱۱) مگر صحت کی خرابی کے باعث یہ کام اپنے شاگرد مولوی شبلی کے سپرد کیا، الاصلاح کی ترقی کے لیے متعدد خطوط علامہ فراہی اور مولانا مسعود ندوی کو لکھے، انتقال کے بعد حمید الدین فراہی نے یہ ذمہ داری لی اور اس کو کل ہند معیار کا مدرسہ بنا دیا اور مولانا کے ادھورے کام کی تکمیل کی۔ علوم قرآن پر ان کی عربی تصنیف کی وجہ سے نہ صرف ان کی عالم گیر شہرت ہوئی، بلکہ مدرسہ کے وزن اور وقار میں بھی اضافہ ہوا۔ چنانچہ اپنے ابتدائی عہد میں مدرسۃ الاصلاح بڑی حد تک علامہ شبلی کے زیر اثر اور ان کے تعلیمی افکار ونظریات کے مطابق چلایا جارہا تھا، علم وادب اور تعلیم وتدریس کے میدان میں ہی میں نہیں بلکہ ملکی سیاست کے جو رجحانات یہاں مقبول ہوئے ان کا تعلق بھی علامہ شبلیؒ سے تھا، مدرسۃ الاصلاح ''دبستان شبلی'' کا ایک اہم حصہ رہا ہے۔ دبستان شبلی علم ودانش تحقیق وتنقید اور طرز نگارش اور اسلوب بیان کی اس روایت کا نام ہے جس کی بنیاد علامہ شبلی نے ڈالی ہے۔

حرف آخر

پیش کردہ تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ تعلیم اور تعلیمی سرگرمیوں سے متعلق شبلی نے نہایت سرگرم زندگی گزاری۔ علی

گڑھ سے ندوہ تک کے سفر میں انھوں نے بہت کچھ صرف اور صرف تعلیم کے لیے ہی برداشت کیا۔ زندگی کے نامساعد حالات کا سامنا بھی انھوں نے تعلیم کے لیے ہی کیا۔ نصاب سے متعلق ان کی اصلاحات کو اگر اس وقت قبولیت مل گئی ہوتی تو آج تعلیمی صورت حال یکسر مختلف ہوتی۔ بلاشبہ علامہ شبلی نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم اسلام کے مایہ ناز عالم و مصنف اور فکر و مصلح اور ادیب و انشا پرداز تھے ان کی بلند پایہ علمی و دینی خدمات جہاں اسلامی تاریخ کا انتہائی روشن باب ہیں وہیں ان کی ادبی و تنقیدی خدمات ادبیات عالم کا جز و حسین جمیل ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، ۱۹۹۳، ص، ۱۴۹

۲۔ ڈاکٹر الیاس اعظمی، خانوادہ شبلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۲۴، ص، ۹۶

۳۔ علامہ شبلی نعمانی، مقالات شبلی، مطبع معارف اعظم گڑھ، جلد، سوم، ص، ۱۶۳

۴۔ حیات شبلی، ص، ۱۷۵

۵۔ خانوادہ شبلی، ص، ۸۶

۶۔ حیات شبلی، ۴۱۵

۷۔ خانوادہ شبلی، ص ۸۶

۸۔ حیات شبلی، ۴۱۸

۹۔ حیات شبلی، ص ۳۲۵

۱۰۔ ڈاکٹر الیاس اعظمی، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں شبلی کا حصہ دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۲۱، ص ۱۵۹

۱۱۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، شبلی پر ایک نظر، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۰۲، ص، ۱۱۸

☆☆☆

اقبال دردؔ۔ ورنگل، تلنگانہ، انڈیا

غزل

انھیں زخم اپنا دکھانا نہیں ہے
ہنسانے کے بدلے رلانا نہیں ہے

گریباں مرا چاک کیسے ہوا تھا
یہ راز اب کسی کو بتانا نہیں ہے

کوئی ان کے کوچے کی خبریں بتائے
مرا تو وہاں آنا جانا نہیں ہے

محبت کے بدلے ملے گی عداوت
یہ اب نیکیوں کا زمانہ نہیں ہے

بچی ہے مرے پاس صرف ایک چادر
بس اک اوڑھنا ہے بچھانا نہیں ہے

کرو علم حاصل بنو صاحب فن
بڑا اس سے کوئی خزانہ نہیں ہے

جو اے دردؔ اک نام لکھا ہے دل پر
بچانا ہے اس کو مٹانا نہیں ہے

......ماں......

سید عظمت اللہ بیابانی۔ وجئے نگر کالونی، حیدرآباد

کسی شئے کے وجود میں آنے کے لئے ایک مرکزی ہیئت کی ضرورت ہے۔ بغیر اس مرکزی ہیئت کے کسی شئے کا وجود میں آنا ناممکن ہی نہیں، بلکہ غیر ممکن ہے۔ اِس مرکزی شئے کو ''ماں'' کا تصور دیا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ انسان کے نشوونما کے لئے، جانداروں کی پرورش کے لئے ماں کی ضرورت ہے۔ ''ماں'' ایک مرکزی تصویر ہے جس کے اطراف افرادِ خاندان گھومتے ہیں۔ اس مرکزی کردار کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب سخت وسست حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہمیشہ ہی سے یہ وہ کردار ہے جو ہر سخت وسست، وتُند وتیز، سرد وگرم، شیرین و تلخ حالات کا سامنا کرتے ہوئے نہیں تھکتی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، میری نانی امّی کہا کرتی تھیں کہ ماں اور باپ کی خدمت کرنے سے کبھی پیچھے نہ ہٹنا۔ ماں کے قدموں تلے جنت ہے۔ ماں ایک تقدس آمیز کردار ہے۔ مذہب ہی نہیں بلکہ ایک مہذّب سوسائٹی بھی ماں کا احترام کرنے سے گُریز نہیں کرتی۔ یہ اور بات ہے کہ مغربی معاشرے میں ایک نام نہاد آزادیٔ نسواں تحریک سے خودبخود ماں کے تقدس میں اُن کے ہاں کمی آتی گئی۔ پیرانہ سالی مکان (Old age home) مغربی معاشرے کا ہی چونچلہ ہے۔

اردو ادب میں اکثر جگہ صنفِ نازک کے استعمال میں خیال آرائیاں کی گئیں۔ اور تو اور ایک صنفِ نظم کو ''غزل'' کے نام سے یاد کیا جانے لگا جس کے قریبی معنی ہیں ''عورت سے بات چیت''۔ اس صنفِ نظم میں صنفِ نازک کا تقدس بالائے طاق رکھا گیا۔ شاید وہ عظیم شاعر جسے ''حالؔی'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور شاعرِ مشرق جسے ''اقبال'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، وہ عظیم شعراء کرام ہیں جو ایک تقدس آمیز پیرائے میں عورت کا ذکر کیا گیا جو ماں کی تعظیم کے لئے ہونا چاہیے۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ حضور پاک ﷺ ایک شخص کے پاس گئے جو بسترِ مرگ پر پڑا تڑپ رہا تھا۔ اِس کی جان کنی کی حالت آسان نہیں ہو رہی تھی۔ لوگوں نے اِس کی تکلیف کی آسانی کے لئے حضور پاک ﷺ سے درخواست کی۔ آپ نے اُس کی ماں کو طلب کیا اور اُس کے لڑکے کو معاف کرنے کی صلاح دی۔ جیسے ہی اُس کی ماں نے اپنے بیٹے کو معاف کیا تب اُس بستر مرگ پر پڑے ہوئے بیٹے کی تکلیف دور ہوئی اور وہ آسانی سے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ماں وہ ہے جو اپنے شیر خوار بچے کو پانی لانے کے لئے صفا و مروہ کی چکریں کاٹیں، ماں وہ ہے جو حضرت اسماعیلؑ کو آدابِ فرزندی سکھلائیں، ماں وہ ہے جو اپنا کلیجہ نکال کر اپنے بیٹے کو دیتی ہے تاکہ وہ اپنی محبوبہ کی دلجوئی کرے۔

ماں اور ممتا کا تعلق جانداروں سے ہی نہیں بلکہ بے جان چیزوں سے بھی گہرا تعلق ہے۔ ہر کوئی اس بات کو جانتا ہے کہ دھرتی کو ''دھرتی ماں'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ گنگا ندی کو ''گنگا مائی'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اپنے آبائی وطن کو ''جنم بھومی'' کہا جاتا ہے۔ ماں وہ ہے جو ہر غم کو سہہ کر اپنے سپوت کی پرورش کرتی ہے۔ پرورش کوئی دوسرا بھی کر سکتا ہے، لیکن بدلے کی امید کے ساتھ۔ مگر ماں وہ ہے جس کو کسی بدلے کی امید اور نہ قیمت کا لالچ۔ یہ ہے وہ ماں جو سراسر قربانی کا جیتا جاگتا پیکر ہے۔ وہ قومیں جو اپنی ماؤں کی قدر نہیں کی جیسے کہ انہیں کرنی چاہیے تھی تو ایسی قوموں کا زوال عنقریب ہے۔ ماں کی خدمت میں ہے ترقی پنہاں۔ لفظ ''ماں'' سنتے ہی انسانی دماغ میں ایک ایسی انمٹ ہستی کا تصور آجاتا ہے جس کو کوئی آسانی سے نہیں بھلا سکتا۔ ماں کے لئے اپنا بیٹا کتنی ہی پیرانہ سالی کا ہو وہ اُسے بچہ ہی کہہ کر بلاتی ہے۔ دین و دنیا کی ترقی و کامرانی ماں کی خدمت میں پنہاں ہے۔

دہلی میں جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام تحفظِ آئین کانفرنس کے موقع پر کہی گئی نظم

کیا کہے کس سے کہے مظلوم اپنی داستاں
چھن گیا ہو جس کے سر سے اُس کا اپنا سائباں

اُڑ رہی ہیں دیش میں آئین کی اب دھجّیاں
قاتلوں کے سامنے بے بس ہیں خاکی وردیاں

ہندو مسلم سکھ عیسائی مل کے رہتے تھے جہاں
دس برس میں تم نے آپس میں بڑھادیں دوریاں

نام لے کر دھرم کا لوگوں کو اُکساتے ہو کیوں؟
کس لئے ہو تم ہمارے قاتلوں پر مہرباں؟

خانہ جنگی چھیڑ رکھی ہے جو تم نے دیش میں
گویا دوزخ بن گیا ہے گلشنِ ہندوستاں

ہورہا ہے ہر طرف ظلم و ستم کمزور پر
لُٹ رہی ہیں عصمتیں اور جل رہے ہیں آشیاں

لے کے خنجر اور بھالے ہیں اُٹھے فرقہ پرست
سرپرستی کررہا ہے خود چمن کا باغباں

مسجدوں اور مدرسوں کو ختم کرنے کے لئے
ہورہی ہیں دیش میں اب رات دن سرگوشیاں

جن جیالوں نے لُٹایا اپنا سب کچھ دیش پر
ہورہے ہیں آج اُن کی اشک آنکھوں سے رواں

اور کیا کیا تم کروگے نام لے کر دھرم کا
ساری دنیا میں ہوا رسوا مرا ہندوستاں

کیوں کرائے جارہے ہیں قتل رہبر قوم کے
کیوں حکومت ہورہی ہے قاتلوں پر مہرباں

کب تلک یہ ہم سے پنجہ آزمائی آپ کی
کب تلک جلتے رہیں گے یوں ہمارے آشیاں

جی رہے ہیں ہند میں اب خوف کے سائے میں ہم
قتل کردے جانے ہم کو کوئی بلوائی کہاں

اے وطن تیری نگہبانی ہمیشہ ہم نے کی
تیری آزادی کی خاطر کھودئے لاکھوں جواں

کوئی رہبر ہے نہ ہی اب ترجمان اس کا کوئی
بے سہارا قوم یہ جائے تو اب جائے کہاں

ہیں یہ شاہد گلشنِ ہندوستاں کی سرحدیں
ہم نے دشمن کو نکالا ہے وطن سے بے گماں

اس حسین احمدؒ نے ہم کو کردیا بیدار جب
ریشمی رومال کی تحریک تھی اُٹھی یہاں

بے خطر بڑھتا رہے گا جانبِ منزل یہ اب
زیرِ سایہ ارشدِ مدنی یہ حق کا کارواں

جان کی بازی لگادیں گے وطن تیرے لئے
آج دہلی میں جو آئے ہیں یہ حق کے پاسباں

اے خدا دے دے وطن کی باگ اُن ہاتھوں میں اب
رکھ سکیں قائم جو ہندوستان میں امن واماں

ہورہے ہیں فیصلے قاتل کے کہنے پر سبھی
منصفوں سے کیا رکھیں اُمید زاہد اب یہاں

تنظیم فاطمہ۔ ریسرچ اسکالر، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی

غضنفر کے افسانوں کا تنقیدی مطالعہ

غضنفر دور حاضر کے مشہور و معروف افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں سیاسی، سماجی اور تہذیبی موضوعات کو جگہ دی ہے۔ ان کا ہر افسانہ ذہن اور دل کو گہرائی سے متاثر کرتا ہے۔ وہ اپنے کردار اور ان کے مکالمے کے ذریعے سماج میں ہو رہے سیاسی اور سماجی مسائل پر طنز کستے ہیں۔ افسانہ ''حیرت فروش'' میں راوی اشتہار دیکھتا ہے کہ ''ضرورت ہے حیرتوں کی ایک ایک حیرت کا منہ مانگا دام۔ حیرت فروش اس پتے پر رجوع کرے۔'' یہ پڑھتے ہی وہ حیرت کی تلاش میں نکل جاتا ہے۔ اسے بہت سے حیرت کرنے والے واقعات ملتے ہیں۔ وہ ساری حیرتیں بٹور کر ادارہ حیرت پہنچتا ہے۔ وہاں پہنچ کر اپنی تلاش کی حیرت کے بارے میں بتاتا ہے تو کسی کو کوئی حیرانی نہیں ہوتی۔ وہ بہت پریشان ہوتا ہے کہ اتنی حیرت کے بات پر بھی کسی کو حیرت نہیں ہوئی۔

''یہ پہلی حیرت ملاحظہ کیجیے۔''

بن بیاہی عورت ماں بن گئی۔

''دوسری دکھاؤ!''

جرم ثابت ہو جانے کے باوجود مجرم بری ہو گیا۔

''تیسری دکھاؤ!''

قاتل کو انعام سے نوازا گیا۔

''کوئی اور دکھاؤ!''

گلابوں پر گیندے کھلے۔

''کوئی اور!''

شاخ سے ثمر ٹوٹا زمین پر نہیں گرا۔

''اور!''

پانی میں آگ لگ گئی۔

''اور کوئی!''

سائبانوں سے دھوپ برستی ہے۔

''اور''

آسمان زمین پر اتر آیا۔

''اور''

زمین آسمان پر پہنچ گئی۔

''کوئی اور''

''عجیب ہیں آپ! اور اور کی رٹ لگائے جا رہے ہیں مگر ایک بھی حیرت پر آپ کی آنکھیں نہیں پھیلیں۔ پیشانی پر کوئی لکیر نہیں ابھری۔ کیا یہ حیرتیں آپ کو حیرت انگیز نہیں لگیں؟''

''حیرتیں! حیرت انگیز! نہیں؟ مجھے تو نہیں لگیں۔''

''آپ مذاق کر رہے ہیں جناب!''

''نہیں، میں مذاق بالکل نہیں کر رہا ہوں۔''

''تو کیا سچ مچ یہ آپ کو حیرت انگیز نہیں لگیں؟''

''میں سچ کہہ رہا ہوں، مجھے ان میں حیرت کا شائبہ بھی نظر نہیں آیا۔'' (حیرت فروش۔ حیرت فروش۔ 49-50)

وہ دوسری بار حیرت لے کر دفتر میں پہنچتا ہے۔ وہ وہاں کے ممبر سے کہتا ہے ایک حیرت لے کر آیا ہوں ''کسی کی قابلیت کام آ گئی۔'' یہ سن کر مینجر بہت تعجب کرتا ہے اور اسے منہ مانگا انعام دیا جاتا ہے۔ صرف ایک جملہ ''کسی کی قابلیت کام آ گئی''

سے غضنفر نے تمام ہندوستان کے نظام پر طنز کیا ہے۔ قارئین کو ملک کی حقیقت سے روشناس کرایا ہیں۔

افسانہ ''یوکیلپٹس'' میں قانونی نظام پر طنز کیا ہے۔ یہ کیسا نظام ہے جس میں ایک پیڑ کو انسان سے کئی زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ بیشک پیڑ ہمارے environment کے لیے بے حد ضروری ہے لیکن کسی انسان کی زندگی سے زیادہ تو نہیں۔ پیڑ کی وجہ سے کسان کو نقصان ہو رہا تھا اور اسکا خاندان فاقے کے حالات سے گزرنے لگا اس وقت قانون کو پیڑ کاٹنے کی اجازت دے دینی چاہئے۔ نہ جانے ہمارا سماج اور قانون کس سمت رواہے کہ ایک خاندان دو پیڑھیوں سے آندھی کا انتظار کر رہا ہے صرف اسلئے کہ آندھی میں پیڑ گر جائے اور انکے کھیت میں پھر سے آناج کی پیداوار ہونے لگے۔ غریب کسان جس کے ہر کوشش کے بعد بھی کھیت سے ایک دانہ اناج کا نہ اگا۔ وہ کھیت جس سے اس کا باپ پورے خاندان کی کفالت کرتا۔ اس کے بعد بھی اناج کوٹھیوں میں بھرا رہتا۔ اب اسی کھیت سے ایک وقت کا اناج بھی میسر نہ ہو پاتا۔ وہ ہر جتن کرتا ہے۔ جوتائی، بوائی، سچائی کے ہر حربے کو اپناتا ہے لیکن کسی طرح اس کی کھیتوں میں فصل نہ ہوتی۔ اس کی فصل نہ ہونے کی وجہ اس کے کھیت کے میڑھ پر لگے یوکیلپٹس کے پیڑ تھے۔ جو کھیت میں موجود نمی کو سوکھ لیتا تھا اور بیج زمین کے باہر پھوٹ نہیں پاتی تھی۔ کسان آندھی کے انتظار میں بوڑھا ہو گیا اب اسکے بیٹے آندھی کا انتظار سے پریشان ہو کر پیڑ کو خود ہی کاٹنے لگے۔ تبھی پولیس ان لوگوں کو پیڑ کاٹنے کے جرم میں پکڑ کر لے جاتی ہے۔

افسانہ ''سانڈ'' میں سیاسی اور مذہبی دونوں پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ سانڈ سے مراد سیاسی رہنما معلوم ہوتا ہے جسے ہم خود چن کر اپنے اوپر مسلط کرتے ہیں اور وہ ہمیں فائدہ پہنچانے کی جگہ ہم پر ہی ظلم و جبر سے پیش آتے ہیں۔ اندھی عقیدت مندی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ سانڈ کو عقیدت کے نام پر کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے بغیر اس کی فکر کے کہ یہ سانڈ گاؤں کی فصل اور انسان کو نقصان پہنچا سکیں۔ کسی مراد کو پانے کے لئے گاؤں والے بھگوان کے نام پر سانڈ چھوڑنے کی منت مانتے اور سانڈ گاؤں والوں کا جینا حرام کر دیتے تھے۔ کسی کے کھیت میں گھس اُسکی پوری طرح تیار فصل برباد کر دیتا۔ لوگوں کو اپنی سینگ سے مار مار کر لہولہان کر دیتا۔

"بھلا سانڈ کو بھی کہیں روک کر رکھا جا سکتا ہے۔ سانڈ تو دیوی دیوتا کا پرساد ہوتا ہے۔ اسے بھگوان کے نام پر چھوڑا جاتا ہے اور بھگوان کے نام کا سانڈ بھگوان کی بنائی ہوئی اس دنیا میں کہیں بھی بنا روک ٹوک جا سکتا ہے۔ بھگوان ہی کی طرح اس کا بھی سب پہ حق ہے۔ سب میں اس کا حصہ ہے۔ وہ جو چاہے کھا سکتا ہے۔ اسے روک کر اپنے کو بھگوان کی نظروں میں دوشی اور نرک کا بھوگی بنانا ہے کیا——؟.....چونکہ وہ بھگوان کے نام پر چھوڑا جاتا ہے۔ اس لیے اس کے کھانے پینے اور گھومنے پھرنے میں کوئی کسی طرح کی رکاوٹ نہیں ڈالتا اور وہ آزادی اور بیفکری سے خوب کھا پی کر بہت جلد بچھڑے سے سانڈ بن جاتا ہے۔'' (پارکنگ ایریا۔ سانڈ۔210)

دھام پور نامی گاؤں والوں نے بھی اسی عقیدت کے تحت ایک بچھڑا چھوڑا اور جب وہ سانڈ بن گیا تو پڑوسی گاؤں سورج پور میں اتھل پتھل مچادی۔

> ''ہاں چاچا! پھر گھس آیا ہے اور آج تو اس نے ایسی تباہی مچائی ہے کہ پوچھیے مت۔ نتھو کی بچھیا کو خراب کر دیا۔ چھیدی کے بچھڑے کو سینگ مار دیا۔ بھولو کے بیل کو ٹکریں مار مار کر لہولہان کر دیا۔ کالو کی گائے بھینس کے چارہ پانی کے برتن کو توڑ پھوڑ دیا۔ بدھو اور بھولا کی تیار سبزیوں کو نوچ کھسوٹ کر ملیامیٹ کر دیا۔ اب بھی بورایا ہوا اینڈتا پھر رہا ہے۔ نہ جانے اور کیا کیا کریگا؟ کس کس پر قیامت ڈھائیگا؟''

(پارکنگ ایریا۔سانڈ۔209)

لیکن جب سورج پور باسی ان سے شکایت کرتے تو یہ اس کا جواب اسی اندھے عقیدت کے دلیل سے دیتے۔ گاؤں والوں نے بیحد کوشش کی کہ کسی طرح سانڈ سے چھٹکارا مل جائے لیکن ہے تدبیر ناکام ثابت ہوتی ہے۔ سورج پور گاؤں والوں نے طے کیا کہ وہ بھی ایک سانڈ بھگوان کے نام پر چھوڑ دیں تا کہ وہ بھی دھام پور کے لوگوں کو پریشان کرے لیکن جب دونوں سانڈ ملے تو دونوں میں دوستی ہوگئی۔ اب دونوں مل کر دونوں گاؤں کے لوگوں کو ستانے لگے۔

''دونوں طرف سے سانڈ ایک دوسرے کی جانب ہانکے جانے لگے۔ کچھ دنوں بعد ایک روز ایک عجیب وغریب منظر رونما ہوا۔ دونوں سانڈوں کو لوگوں نے ایک ساتھ گھومتے ہوئے دیکھا۔ دونوں اینڈتے ہوئے پہلے سورج پور گاؤں میں گھسے اور دونوں نے مل کر گاؤں کو روند روند کر ملیامیٹ کیا۔ پھر وہاں سے ایک ساتھ نکلے اور دھام پور میں گھس کر توڑ پھوڑ مچانے لگے۔'' (پارکنگ ایریا۔سانڈ۔214)

افسانہ ''در و دیوار'' فرقہ وارانہ فسادات کے پس منظر میں لکھا گیا بہترین افسانہ ہے وہ پڑوسی جو ایک دوسرے کی ضرورت میں سگے رشتہ داروں کی طرح شریک ہوتے تھے فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے ان میں ساری محبت، اپنائیت اور انسانیت ختم ہو جاتی ہے۔ افسانہ کے راوی کا وہ پڑوسی جو اس کے گھر کی چھت ڈلوانے کے لیے بغیر کسی سود اور پروف کے اس کے بنا مانگے ہی سولہ ہزار روپے کا چیک کاٹ کر دے دیتا ہے لیکن فرقہ پرستی کی آگ میں اس قدر گر جاتا ہے کہ دنگائیوں کی بھیڑ میں شامل ہو کر اسی گھر کو سپرد آگ کر دیتا ہے۔ افسانہ ''خالد کا ختنہ'' بھی اسی موضوع پر لکھا گیا کامیاب افسانہ ہے۔ فرقہ پرستی کے طوفان میں انسانیت کو نظر انداز کر ہندو اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔ خالد جو اپنے پھوپھی زاد بھائی کے ختنے کی تقریب میں اپنے ختنے کے لیے ضد کر رہا تھا وہ اپنے ختنے کی تقریب میں کونے میں چھپا چھپا بیٹھا تھا۔ خاندان رشتہ داروں کے سمجھانے پر بھی وہ ختنے کے لیے بالکل تیار نہیں ہوا۔ جب امی نے وجہ پوچھی تو خالد کے جواب سے والدین اور تمام رشتہ داروں پر خاموشی طاری ہوگئی ختنے کی رسم تو ہوئی لیکن اب وہ خوشی کا ماحول نہیں رہا۔ صرف فرض ادائیگی کر دی گئی۔ نائی نے بھی کوئی نچھاور کی خواہش نہ کی۔ خالد کہتا ہے:

''امی! میں ختنہ کرانے سے نہیں ڈرتا۔''

ابو! آپ ہی نے تو ایک دن کہا تھا کہ جن کا ختنہ ہوتا ہے بدمعاش انہیں جان سے مار دیے ہیں۔ خالد کا جملہ ابو کے ساتھ ساتھ سب کے سروں پر فالج کی طرح گر پڑا۔ سب کی زبانیں اینٹھ گئیں۔ چہکتا ہوا ماحول چپ ہو گیا۔ جگمگاہٹیں بجھ گئیں۔ مسکراہٹیں مرجھا گئیں۔ بچوں کی انگلیاں اپنے پاجاموں میں پہنچ گئیں۔ تلاشیوں کا گھناؤنا منظر ابھر گیا۔ جسم ننگے ہو گئے۔ چاقو سینے میں اترنے لگے۔ ماحول کا رنگ اڑ گیا۔ نور پر دھند کا غبار چڑھ گیا۔ خوشبو بکھر گئی۔ نائی کا استرا بھی کند پڑ گیا۔ راکھ پر پانی پھر گیا۔ پاکستان والے خالو نے ماحول کے بوجھل پن کو توڑتے ہوئے خالد کو مخاطب کیا۔

''خالد بیٹے! اگر تم ختنہ نہیں کراؤ گے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ تمہارا ختنہ نہ دیکھ کر تمھیں ختنہ والے بد معاش مار ڈالیں گے۔'' (حیرت فروش، خالد کا ختنہ، ص۔71)

افسانہ ''کڑوا تیل'' میں بیل، کولہو کا مالک شاہ جی اور راوی کی شکل میں مظلوم، ظالم اور سماج کو پیش کر ہمارے معاشرے کی حقیقی صورتحال پر طنز کیا ہے۔ مظلوم ظلم کے خلاف بغاوت کی جگہ ظلم کو اپنا مقدر مان کر چپ چاپ ظلم سہتا رہتا ہے۔ سماج افسوس کے الاوہ کچھ نہیں کرتا۔

ڈاکٹر ناظر حسین خان۔شعبۂ اردو کرائسٹ چرچ کالج دی مال، کانپور (یوپی)

پری ناز اور پرندے-ایک تنقیدی مطالعہ (پانچویں قسط)

ناول میں اتفاقات اور کام پورا ہونے کے بعد کردار کی موت کا یہ سلسلہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا بلکہ قصہ لکھنے والے کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ایک لمبے عرصے سے قصہ لکھنے والا بیمار چل رہا ہے، اِس بیماری کے درمیان اس کی حالت اتنی خراب ہو جاتی ہے کہ وہ مرتے مرتے بچتا ہے، یعنی اس کو مرنے نہیں دیا جاتا ہے۔اور اس کے بعد ناول نگار بہت ہی چالاکی سے قصہ لکھنے والے سے اس کے حصے کا کام دھیرے دھیرے لینا شروع کرتا ہے۔قصہ لکھنے والے کی راوی اور فرش آرا سے پہلی ملاقات میں طبیعت خراب کا دکھانا اور دوسری ملاقات میں ان کی طبیعت کو حساس بشاش دکھا کر طاؤس چمن کے اندر اور باہر دونوں ہی قصوں کو بتانا، قصہ لکھنے والے کے ہاتھوں راوی کو ایک ہزار روپیوں کی بڑی رقم اس کے گھر کو بسانے کے لیے دینا اور پھر طاؤس چمن کے قصے کو چھپ کر آنے کے بعد ہی ان کا انتقال ہونا وغیرہ ان تمام واقعات سے ایسا لگتا ہے کہ ناول نگار نے قصہ لکھنے والے سے ان کے حصے کا کام لے کر آخر میں ان کا قصہ بھی ختم کر دیا:

''۔۔۔ٹوریا گنج پہنچ کر جب ہم سفید رنگ کی عمارت کے احاطے میں داخل ہوئے تو باہر بہت سے لوگ خاموش کھڑے تھے۔انہیں لوگوں میں سے مرزا نے آگے بڑھ کر بتایا:

''میاں نہیں رہے۔صبح کی نماز کے لیے آنکھ کھولی لیکن نماز نہیں پڑھ سکے۔سینے پر سجدہ گاہ دھرے دھرے اس دنیا سے چلے گئے۔'' یہ کہہ کر مجھ سے کہا: ''جو کتاب تم پچھلی بار دے گئے تھے وہ فلک آرا کے قصے والی، جب وہ چھاپے خانے سے آئی تو بٹیا کو بہت یاد کیا۔کہنے لگے پہلی کتاب اسی کو دوں گا۔'' ص۔۲۸۳۔۲۸۴

اب تک کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ناول میں جن جن کرداروں کی موتیں ہوئی ہیں وہ سب اپنے حصے کا کام پورا کر کے ہی مرے ہیں۔مرے ہوئے کسی بھی کردار کے حوالے سے قاری کے ذہن میں یہ تجسس نہیں رہتا کہ فلاں کردار کو تھوڑا اور زندہ رہنا چاہئے تھا یا اس کے ذریعے یہ کام اور بھی ہونا چاہیے تھا۔سارے کرداروں سے ناول نگار نے ان کے حصے کا کام لے کر ہی ان کو ختم کیا ہے۔بہ الفاظ دیگر اگر یہ کہیں تو غلط نہ ہوگا کہ اس ناول میں ناول نگار نے خوش گوار اختتام (Happy Ending) کو بخوبی نبھایا ہے۔خود ناول نگار بھی اس کے خواہاں ہیں۔اسی ناول کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے جس کے ذریعے ناول نگار نے قصہ لکھنے والے کی زبانی خوش گوار اختتام کے حوالے سے اپنے من کی بات بھی کہلوادی ہے۔:

''یہ بتانے کے بعد صاحب نے بتایا:

''بتانے والوں نے مجھے یہیں تک بتایا۔بتائی ہوئی باتوں میں میں نے وہی باتیں لکھیں جو حقیقت کم افسانہ زیادہ معلوم ہوں۔اور کالے خان کے بنارس میں جا کر رہنے کی بات میں نے اپنی طرف سے لکھی۔اگر وہ لکھتا جو مجھے بتایا گیا تھا تو قصے میں رنج کا پہلو نکل آتا اور میں نے، جنہوں نے میرے قصے پڑھے ہیں انہیں معلوم ہے، ایسے قصے نہیں لکھے جو اپنے خاتموں پر پڑھنے والوں کو رنجیدہ کریں۔''

یہ کہہ کر صاحب نے فرش آرا سے کہا:

''اسی لیے میں نے قصے کو تمہاری ماں کی معصومیت پر ختم کیا۔'' ص ۲۴۷

اس سے پتا چلتا ہے کہ ناول نگار اپنے ناول یا کہانی میں

خوش گوار اختتام کے قائل ہیں۔اسی لیے اپنے کرداروں سے ان کے حصے کا کام لے کر ہی ان کا کام ختم کرتے ہیں۔

اردو کے کسی افسانہ نگار کے افسانے پر بالی وڈ میں فلم بنائی گئی۔ جب فلم بن کر آئی اس وقت اس فلم اور افسانے میں بہت فرق تھا۔ پوچھنے پر ڈائیریکٹر نے جواب دیا،''فلم کو ہم ناظرین کے پسند کے اعتبار سے بناتے ہیں،اس لیے ہم نے اصل افسانے میں کئی جگہوں پر کاٹ چھانٹ کی۔'' ہمارے ہندوستانی ناظرین کو خوش گوار اختتام Happy Ending پسند ہے ،پروفیسر انیس اشفاق نے اپنے اس ناول میں اس بات کا پورا خیال رکھا ہے اور ساتھ ہی انہوں نے اس کا بھی خیال رکھا ہے کہ اگر مستقبل میں کوئی ڈائیریکٹر اس ناول پر فلم بنانا چاہے تو کہانی کی کاٹ چھانٹ میں اس کا وقت ضائع نہ ہو۔اسی لیے انہوں نے خوشگوار اختتام کو انجام دیا ہے۔

دیگر اتفاقات:

کرداروں کی موت کے اتفاق کے علاوہ اس ناول میں کچھ اور بھی حسین اتفاقات ہوئے ہیں جن کی طرف راقم قاری کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہے۔ مثلاً جب کسی ایک کردار کا کسی دوسرے کردار کے ساتھ مکالمہ ہوتا ہے اور اسی موضوع کے حوالے سے جب کسی تیسرے کردار سے بات ہوتی ہے تو ٹھیک ویسے ہی باتیں یہاں بھی عمل میں آتی ہیں۔مثال کے طور پر راوی کی ایک مختصر گفتگو ملاحظہ فرمائیں جس میں وہ فرش آرا کے حوالے سے کچھ بات کرتا ہے:

''کل فرش آرا کے ساتھ یوسف مرزا کے بتائے ہوئے علاقے میں جاؤں گا۔''

''جاؤ اور آ کر بتاؤ۔دل کہتا ہے اس بار تم ضرور کامیاب ہوگے اور ہاں اپنی میناؤں کی طرح فرش آرا کا دل بھی بہت نازک ہے۔کسی بات پر ناراض ہونا تو کوئی سخت بات نہ کہہ دینا۔''

''نہیں بابا۔ بری لگنے والی بات وہ کرتی ہی نہیں اور کوئی بات بری ہوتی بھی ہے تو اس کا برا نہیں مانتیں۔''

ص۔۱۴۸

اب اگلے دن جب فرش آرا راوی سے ملتی ہیں اس وقت کی گفتگو ملاحظہ فرمائیں:

''اماں آپ کا بہت خیال رکھنے لگیں ہیں۔کہہ رہی تھیں۔۔۔''

''کیا کہہ رہی تھیں؟''

''بیٹا کبھی اس کی طرف سے ملال ہو تو دل میلا نہ کرنا۔ اس کا دل بہت دکھا ہوا ہے۔جانے انجانے کڑوی بات اس کے منہ سے نکل سکتی ہے۔''

''آپ نے کیا کہا؟''

''میں نے کہا اب تک تو نہیں نکلی، آگے بھی شاید نہ نکلے۔''

''عجیب بات ہے۔''

''کیا عجیب بات ہے؟''

''یہی بات کل بابا، جب میں ان سے رخصت ہو رہا تھا مجھ سے کہہ رہے تھے۔ کہہ رہے تھے فرش آرا بہت نازک دل کی ہے۔کسی بات پر ناراض ہونا تو کوئی سخت بات نہ کہہ دینا۔''

''آپ نے کیا کہا؟''

''میں نے کہا:''بری لگنے والی بات وہ کرتی ہی نہیں۔''

ص۔۱۵۰

یعنی جو فطرت راوی کی ہے وہی فطرت فرش آرا کی بھی ہے ایک طرف بابا تو دوسری طرف فلک آرا ،یہ دونوں لوگ دونوں کے کردار کے حوالے سے مماثلت رکھنے والی باتیں کرتے ہیں۔خیر اگر دونوں کو ملانا ہے تو ناول نگار کو کردار کی یہ مماثلت پیدا کرنا ہی پڑے گی۔ اگر کہیں دو اشخاص کا کردار ملتا ہے تو ان کی عادتوں میں مماثلت کا ہونا لازمی ہے مگر کوئی ایک کردار اپنے ساتھی کردار کے حوالے سے کچھ سوچے اور وہ سوچا ہوا اگلے دن

سچ ثابت ہونے لگے تو یہ واقعہ واقعی اتفاق کے مبالغے کو دعوت دیتا ہے۔ راوی اور فرش آرا دن بھر ساتھ تھے، شام کو اپنے اپنے گھر جاتے ہیں۔ راوی جب اپنے کمرے پر آتا ہے تو سوچتا ہے:

''آنکھیں بند کرنے سے پہلے میں نے سوچا فرش آرا ابھی جاگ رہی ہوں گی اور میری ہی طرح انہوں نے بھی بس ابھی ابھی لالٹین جلائی ہوگی۔ پھر میں سوچنے لگا لالٹین انہوں نے کہاں لٹکائی ہوگی۔ یہ سوچتے ہی خوف کی ایک لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ مجھے یہ ڈر ستانے لگا کہ فلک آرا پھوس کے چھپر میں رہتی ہیں۔ لالٹین اگر بے احتیاطی سے لٹکائی گئی تو رات میں کسی وقت گر کر ٹوٹ سکتی ہے اور پھوس کے تنکے آگ پکڑ سکتے ہیں۔ یہ سوچتے ہی میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ میرا جی چاہا میں اسی وقت جھانکڑ باغ جا کر دیکھوں کہ فرش آرا نے لالٹین ایسی جگہ تو نہیں لٹکائی جہاں سے گر کر وہ ٹوٹ جائے۔ یہ وسوسہ میرے دل میں ایسا بیٹھا کہ مجھے بہت دیر بعد بڑی مشکل سے نیند آئی۔ بستر پر کروٹ بدلتے وقت جب بھی میری آنکھ کھلتی مجھے فرش آرا کی لالٹین کا خیال آتا اور اس کے بعد ایک اور ڈراؤنا خیال آنے لگتا: 'چھپر میں آگ لگی تو ماں بیٹی اپنی چڑیوں کو بچانے میں لگ جائیں گی اور اسی وقت آگ کی لپٹیں انہیں پکڑ لیں گی۔'' ص۔۱۲۴

اگلے دن جب فرش آرا راوی کے گھر آتی ہیں تو دوران گفتگو وہ بات راوی کو بتاتی ہیں:

''ارے ہاں کل۔۔۔کل ایک عجیب بات ہوئی۔۔۔''

کیا ہوا؟''

''کل مغرب کے وقت، سارا کام کرنے کے بعد جب میں چھپر کے بانس میں لالٹین لٹکا رہی تھی تو۔۔۔''

''کیا ہوا لالٹین کو۔۔۔؟'' میں نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی اور چمنی اس کی ٹوٹ گئی۔'' فرش آرا نے کہا ''میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ لالٹین کی لَو پر جو گرنے کے بعد اور تیز ہوگئی تھی، اپنا دوپٹہ ڈال دیا اور دونوں ہاتھوں سے اسے دبانے لگی لیکن لَو پر دوپٹہ آتے ہی اس نے آگ پکڑ لی اور جب تک شعلے بلند ہوں اماں دوڑ کر آنگن سے تسلے میں مٹی لے آئیں اور دوپٹے میں لگی ہوئی آگ پر اس مٹی کو ڈال دیا۔ آگ بجھی تو اماں غصے سے بولیں:

''فرش آرا ان دنوں تم کھوئی کھوئی رہتی ہو کسی کام میں تمہارا دل نہیں لگتا۔ کل سے گھر کا سارا کام میں کروں گی۔'' یہ کہہ کر فرش آرا نے بتایا:

''۔۔۔۔میں اس لالٹین کو جس میں دوسری چمنی لگا کر اماں نے چھپر میں لٹکایا تھا، رات بھر اٹھ اٹھ کر دیکھتی رہی۔ اِسی میں مجھے رات بھر نیند نہیں آئی۔'' ص۔۱۲۷

اب راوی کہتا ہے:

''اسی لیے کل مجھے رہ رہ کر۔۔۔'' میں کہتے کہتے رکا۔

''کیا رہ رہ کر۔۔۔؟''

''آپ کی لالٹین کا خیال آرہا تھا۔ یہ وہی وقت تھا، مغرب کے بعد کا۔ اسی وقت آپ نے اپنے یہاں لالٹین روشن کی ہوگی۔''

''کیا خیال آرہا تھا آپ کو؟''

''آپ نے لالٹین چھپّر میں ٹھیک سے لٹکائی ہے کہ نہیں، ٹھیک سے نہ لٹکائی تو گر کر ٹوٹ سکتی ہے اور۔۔۔''

''چھپر میں آگ لگ سکتی ہے۔۔۔'' ص۔۱۲۷۔۱۲۸

اب آگے کے مکالمے میں راوی اپنی اس بات کا جواز بھی پیش کرتے ہیں:

''۔۔۔۔کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے جو ہونے والا ہوتا ہے وہ کسی اور کے ذہن میں بھی آجاتا ہے۔''

''لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے؟''

''یہ میں نہیں بتا سکتی اور شاید آپ بھی نہ بتا سکیں۔'' ص۔۱۲۸

ناول نگار کے یہ دونوں کردار بہت بھولے ہیں اور ایسے بھولے پن کا مظاہرہ دونوں کی طرف سے اور خاص کر راوی کی طرف سے اس ناول میں کئی جگہوں پر دیکھنے کو ملتا ہے۔

مذکورہ اتفاق کے حوالے سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے ذریعے ناول نگار ان دونوں کے درمیان قربت کو ظاہر کرانا چاہتا ہے تاکہ بعد میں ان کی شادی کو لے کر قاری کے ذہن میں سوال نہ پیدا ہو۔ یہ ایک دوم درجے کے پلاٹ کو پیدا کرنے کی کوشش ہے۔ اب ایسے ہی کچھ اور پلاٹ یا کرشمے ہیں جو اس ناول میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جب پہلی بار راوی اور فرش آرا قصہ لکھنے والے کے گھر پر ان سے ملنے جاتے ہیں اس وقت ان کی طبیعت خراب رہتی ہے، بہو صاحب فرماتی ہیں:

''وہ ٹھیک سے بول نہیں پاتے اور اب سنتے بھی کم ہیں۔ کئی سالوں سے بستر پر ہیں۔'' ص۔۱۵۷

طبیعت اس قدر خراب ہے کہ وہ کروٹ بھی نہیں بدل سکتے:

''آپ دونوں کسی اور دن آیئے۔ آج تو وہ کروٹ تک نہیں بدل رہے ہیں۔ آنکھیں بند کیے پڑے ہیں۔۔۔'' ص۔۱۵۹

بڑھاپا بھی ہاوی ہے اس قدر کہ طبیعت ٹھیک رہنے پر بھی ان کی زبان میں عمر کی وجہ سے لکنیت رہتی ہے:

''اور ضروری نہیں کہ وہ بول کر کچھ بتا سکیں۔ کبھی کبھی لکنت بہت بڑھ جاتی ہے اور پوری بات ان کی زبان سے نہیں نکل پاتی اور جو ٹکڑوں میں نکلتی ہے وہ بے ربط ہو جاتی ہے۔'' ص۔۱۵۹۔۱۶۰

اور کبھی کبھی لکنت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ نام لینے سے بھی قاصر ہو جاتے ہیں:

''زبان میں لکنت کی وجہ سے چڑیا کا نام، اور نام بھی تو عجیب عجیب رکھے ہیں، دیر میں لے پاتے ہیں۔ ایک دن 'نٹ کھٹ نرالی' اپنی ایک بہت شوخ چڑیا کا نام بہت کوشش کے باوجود نہیں لے سکے تب ان کی آنکھوں میں آنسوں آ گئے۔'' ص۔۱۶۱

ان تمام وجوہات کی بنیاد پر راوی اور فرش آرا کو چار دنوں کے بعد دوبارہ بلایا گیا۔ جب اگلی بار یہ دونوں قصہ لکھنے والے سے ملنے کے لیے آتے ہیں تو ان کی طبیعت درست کی خبر پاتے ہیں۔ نوکر مرزا نے ان کو دیکھتے ہی کہا:

''آؤ آؤ۔ بہو صاحب نے تمہیں آج ہی بلایا تھا۔ میاں کی طبیعت کچھ کچھ ٹھیک ہوئی ہے۔'' ص۔۲۱۰

طبیعت تو ٹھیک ہے مگر ابھی بھی یہ امید نہیں ہے کہ ان کو اندر بلا ہی لیا جائے، کیوں کہ جب پہلی بار یہ یہاں آئے تھے تو اس کے دوسرے ہی دن قصہ لکھنے والے کی طبیعت ایک دم سے بگڑ گئی تھی:

''تم جب آئے تھے اس کے دوسرے دن حالت اتنی بگڑی کہ آنکھیں پلٹ گئیں اور ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ گئے، گھر میں رونا پیٹنا شروع ہو گیا۔ جھوائی ٹولے کے حکیم کو لانے آدمی دوڑایا گیا۔ انہوں نے نبض دیکھ کر دوا دی تو طبیعت سنبھلی مگر بے چینی اب بھی ہے۔'' ص۔۲۱۰

اس لیے ممکن نہیں کہ آج بھی ملاقات ہو جائے، نوکر کہتا ہے:

''ٹھہرو میں اندر بتا کر آتا ہوں۔ میاں کی طبیعت ٹھیک ہوئی تو بہو صاحب اندر بلائیں گی نہیں تو۔۔۔ واپس جانا پڑے گا تمہیں۔'' ص۔۲۱۰

اور ناول نگار نے قصے کو آگے بڑھانے کے لیے یہاں پر کرشمائی طور پر قصہ لکھنے والے کو پوری طرح سے ٹھیک کر راوی اور فرش آرا سے ملاقات کا راستہ نکالا ہے:

''اچھی خبر ہے۔ تمہیں واپس نہیں جانا پڑے گا۔ میاں کی طبیعت ٹھہری ہوئی ہے۔'' ص۔۲۱۰

اس ملاقات میں قصہ لکھنے والا کالے خان کی بیٹی فلک آرا کا نام سنتا ہے اور جب اس کو پتا چلتا ہے کہ فرش آرا جو میرے سامنے بیٹھی ہے وہ فلک آرا کی بیٹی ہے تو ایسے میں ان کے اندر ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا ہو جاتا ہے:

''فلک آرا کی بیٹی؟''

''جی۔ہم اسی الماس خانی اینٹوں والے مکان میں رہتے ہیں، جس میں ہمارے نانا رہتے تھے، کالے خان۔۔۔'' ص۔۲۱۸

کمال کہیے یا اتفاق یہ نام سنتے ہی قصہ لکھنے والا جو بیماری کی حالت میں کروٹ بھی نہیں بدل سکتا تھا اور طبیعت خراب رہنے کی وجہ سے زبان کی لکنیت عام بات ہوگئی تھی اب چار ہی دن میں بیٹھنے کی کوشش کے ساتھ ان کی زبان کی لکنیت بھی غایب ہوگئی تھی:

''۔۔۔رک رک کر بولنے کے بجائے اب وہ پورے پورے جملے ادا کر رہے تھے:

''فلک آرا۔۔۔تم فلک آرا کی بیٹی ہو؟ انہوں نے اونچی آواز میں پوچھا۔ان کی آواز کی نقاہت غائب ہوگئی تھی۔'' ص۲۱۸

نہ صرف آواز کی لکنیت غائب ہوئی تھی بلکہ ان کی طبیعت کے اندر ایک روانی بھی آگئی تھی۔ایسا لگتا تھا کہ قصہ لکھنے والا ایک دم سے جوان ہو گیا ہے اور اسے کوئی بیماری کبھی تھی ہی نہیں۔وہ روانی میں طاؤس چمن کا قصہ راوی اور فرش آرا کو بتانے لگے۔قصہ لکھنے والا جس انداز میں راوی اور فرش آرا کو طاؤس چمن کی باتیں بتا رہا تھا اس کو دیکھ کر بہو صاحب کو حیرت کے انداز میں یہ کہنا پڑا:

''آپ نے تو سب اس طرح بتایا جیسے مرزا چبوترے پر سب کو بٹھا کر داستان سنا رہے ہوں۔''ص۔۲۲۳

اور جب قصہ لکھنے والے کا ایک تواتر سے بولنے کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہوتا ہے تو مجبوراً پھر بہو صاحب کو کہنا پڑا:

''اچھا طبیعت ٹھیک ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بولتے چلے جایئے۔''بہو صاحب نے صاحب سے کہا۔''یہ لوگ کسی اور دن آجائیں گے۔''ص۔۲۲۳

مگر آج تو قصہ لکھنے والا ایک الگ ہی جوش میں تھا، بہو صاحب کے روکنے پر بھی نہیں رکا اور اپنی زندگی کو داؤں پر لگا کر کہتا ہے:

''نہیں طبیعت ٹھیک ہے تو جو لکھا ہے بتا لینے دو۔جو نہیں لکھا ہے کسی اور دن بتا دیں گے۔''ص۔۲۲۳

ناول کے دیگر کرداروں کی حالت کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ ناول نگار قصہ لکھنے والے سے بھی اس کے حصے کا کام جلدی جلدی کروا کر ان کو بھی ختم کرنا چاہتا ہے اس لیے جب راوی اور فرش آرا اگلی بار ان سے ملنے جاتے ہیں تو قصہ لکھنے والے کی طبیعت ایسا لگتا ہے کہ اب ہمیشہ کے لیے ٹھیک ہو چکی ہے یا کم سے کم اتنا تو ناول نگار نے ٹھیک کر ہی دیا ہے کہ راوی اور فرش آرا کو پورا قصہ بتا سکے۔دوسری مرتبہ دروازے پر پہنچتے ہی قصہ لکھنے والے کے نوکر نے کہا:

''تم نے وہ کام کیا جو وید اور حکیم نہ کر سکے۔تمہارے آنے کے بعد سے میاں کو نہ تپ چڑھی نہ بولنے میں تکلیف ہوئی۔بہت دن بعد مجھ سے بھی بہت دیر باتیں کیں۔'' ص۔۲۳۹

بہو صاحب بھی اس کرشمے کو تسلیم کرتی ہیں:

''تم لوگوں کے آنے سے ان کا دل بہل گیا۔زبان کی لکنت سمجھو نہیں کے برابر ہے، بخار بھی نہیں چڑھا۔اس دن کے بعد سے خوب باتیں کر رہے ہیں ورنہ دن بھر میں ایک دو جملوں سے زیادہ نہیں بولتے تھے۔''ص۔۲۴۰

اور تو اور واقعی یہ کرشمہ ہوا ہے یہ ثابت کرنے کے لیے ناول نگار نے راوی کے ذریعے بابا کو بھی یہ بات بتائی:

''۔۔۔لیکن جب سنا کہ فرش آرا فلک آرا کی بیٹی ہیں تو اس کے بدن میں جان آگئی۔''میں نے بابا کو بتایا:''لگ ہی نہیں رہا تھا بہت دنوں سے بیمار ہے۔''ص۔۲۳۴

خیر قصے کو آگے بڑھا کر اپنے تکمیل تک پہنچانا تھا تو ناول نگار کو یہ تمام کرشمے یا یوں کہیے کہ یہ پلاٹ پیدا کرنے ہی تھے وہ الگ بات ہے کہ یہ پلاٹ بہت اول درجے کے ثابت نہیں ہو رہے ہیں۔

☆☆☆

احمد نور عینی۔استاذ المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

علامہ شبلیؒ نعمانی (1857-1914)

مثلِ خورشیدِ سحر فکر کی تابانی میں

زائد از ڈیڑھ صدی پہلے کی بات ہے، یعنی اس زمانے کی بات ہے جب ہندوستان جنت نشان کی سونا اگلتی دھرتی پر استعمار اپنے اقتدار کے پنجے بے رحمی کے ساتھ گاڑنے میں کامیاب ہو رہا تھا، ہندوستان کا دل شہرِ دلی مغلیہ عظمت وشوکت کی آخری دھڑکنیں گن رہا تھا، دلی کا مرکزِ اقتدار لال قلعہ انتقالِ اقتدار کا ماتم کر رہا تھا، گویا مغلیہ سلطنت کا وہ آفتاب جو اورنگ زیب کے بعد لب بام آگیا تھا ہمیشہ کے لیے غروب ہوا چاہتا تھا۔ ٹھیک اسی زمانے میں اتر پردیش کے ایک مردم خیز خطہ اعظم گڈھ میں ایک ایسا آفتاب طلوع ہوتا ہے جو آگے چل کر علم کدوں میں تحقیق کی کرنیں بکھیرتا ہے، مخالفت کی ہوائیں ہر چند اس کی ضیا گستری کو بدلیوں کی اوٹ میں چھپانا چاہتی ہیں مگر اس کی کرنیں بدلیوں کا سینہ چیر کر نیچے اترتی جاتی ہیں۔ جس زمانے کی یہ بات ہے وہ ۱۸۵۷ء کا سال ہے اور اعظم گڈھ کے جس آفتاب کا تذکرہ ہے اسے دنیا شبلی نعمانی کے نام سے جانتی ہے۔

علامہ شبلیؒ قافلۂ سخت جاں کے وہ سالار تھے جن کی صحرا نوردی کو ریگستانی ہواؤں کے جھکڑ بھی نہ روک سکے، اور جن کی آبلہ پائی کے نقوش آج بھی کاروانِ علم وتحقیق کو منزل کا پتہ دیتے ہیں۔ علامہ شبلیؒ کی شخصیت بیسویں صدی میں تعلیمی انقلاب کا عنوان ہے، مردم سازی ومصنف گری کا نام ہے، تخلیق وتحقیق سے عبارت ہے۔ علامہ شبلیؒ گونا گوں خصوصیات کے حامل اور مختلف صلاحیتوں کے مالک تھے، میدانِ ادب کے شہسوار بھی تھے اور اقلیمِ علومِ اسلامیہ کے تاجدار بھی، تاریخ کے بحر متلاطم کے غوطہ خوار بھی تھے اور سیرت نگاری کے انوکھے اسلوب میں یکتائے روزگار بھی، انگریزی کی ترویج کے لیے طبقۂ قدیم سے برسرِ پیکار بھی تھے اور قدیم صالح وجدید نافع کو جمع کرنے کے علم بردار بھی۔ دامنِ اسلام سے شبہات کے داغ دور کرنا ان کی فکر تھی، آریہ سماجیوں کے بڑھتے قدم کو روکنا ان کا دردِ دل تھا، تاریخ کو مستشرقین ومعاندین کی زہر آلود تحریفات سے پاک کرنا ان کا مشن تھا، علم کلام کی تدوینِ نو ان کا عزم تھا، تعلیمی انقلاب اور اصلاحِ نصاب ان کی فکری وعملی مساعی کا محور تھا۔

جس زمانے میں انگریزی کے نام سے ہی لوگوں کی روح نکل جاتی تھی اور اختیاری مضمون کی حیثیت سے بھی اس کی تعلیم الحاد کی تخم ریزی تصور کی جاتی تھی، اس زمانے میں شبلی نے نہ صرف یہ کہ انگریزی زبان کو بہ حیثیت لازمی مضمون کے داخلِ درس کیا؛ بل کہ انگریزی میں مہارت پیدا کرنے کے لیے مستقل دو سال کا کورس شروع کرنے کی تجویز پیش کی (حیات شبلی: ۳۳۶)۔ انگریزی کے لیے دو سال کے خصوصی کورس کا جو خواب شبلی نے دیکھا تھا اسے

شرمندۂ تعبیر ہونے میں ایک صدی کا وقت لگا، گویا بیسویں صدی کے شروع میں شبلی جس بلند مقام پر کھڑے تھے وہاں تک پہنچنے میں اہلِ علم کے کارواں کو ایک صدی لگی۔

علامہ شبلیؒ نے جہاں اپنے قلم سے تاریخ کا مقابلہ کیا وہیں ندوہ میں 'صیغۂ تصحیح اغلاط تاریخی' کے نام سے ۱۹۱۰ء میں ایک شعبہ بھی قائم کیا، جس کا سکریٹری مولانا سید سلیمان ندویؒ کو بنایا، سید صاحب نے بہت محنت اور لگن سے کام کیا اور بہت سی تاریخی اغلاط کو جمع کر کے ایک رپورٹ تیار کی جو انھوں نے ندوہ کے سالانہ جلسہ میں پڑھ کر سنائی؛ لیکن افسوس کے تاریخ کا یہ شعبہ بہت جلد تاریخ کا حصہ بن گیا، اور شبلی کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوتے ہوتے پھر خواب کی شکل اختیار کر گیا؛ البتہ شبلیؒ کے دارالمصنفین نے تاریخ کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں تاریخ انھیں ضرور یاد رکھے گی۔

ہندی و سنسکرت کی تعلیم کے تعلق سے علامہ شبلیؒ کے دل کو بے چین رکھنے والی فکر اگر شبلیؒ کے بعد بھی مسلم قائدین کو بے کل رکھتی تو آج ہمارے ملک میں دعوت دین کا کام بھی آسان ہوتا، آر۔ایس۔ایس کے نفرت انگیز و زہر آمیز لٹریچر کا جواب بھی بہ حسن وخوبی دیا جاسکتا اور بھارتی سماج میں پھیلائی جانے والی نفرت کی آگ ہمارے لٹریچر کے سامنے سرد ہوتی نظر آتی۔ شبلیؒ کو گذرے ایک صدی ہوگئی، مگر افسوس کہ دفاع اسلام کا یہ محاذ ابھی بھی مسلح سپاہیوں کی راہ دیکھ رہا ہے اور زبانِ حال سے یہ صدا لگا رہا ہے:

کون سی وادی میں ہے؟ کون سے منزل میں ہے؟
عشق بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں؟!

علامہ شبلی نے فضلا کی تربیتِ تحقیق وتالیف کے لیے دارالمصنفین کا خاکہ ندوہ کے زمانہ میں ہی بنالیا تھا لیکن ندوہ کے نامساعد حالات نے علامہ شبلی کو اس خاکہ میں رنگ بھرنے نہیں دیا؛ مگر جب شبلی اس کوئے یار سے نکل کر اپنے دیار آئے تو اپنے خون جگر سے اس خاکہ میں رنگ بھرا اور دارالمصنفین کے لیے فضلا کو مدعو کیا، عشق بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں تیار تھا، قافلہ سالار پر عزم تھا کہ

میں ظلمت شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس میرا شعلہ بار ہوگا

فضائے دشت میں بانگِ رحیل گونجا ہی چاہتی تھی کہ میرِ کارواں راہیِ ملکِ عدم ہوگیا، اہل کارواں کو اس کا صدمہ ضرور ہوا؛ لیکن یہ صدمہ ان کی راہ میں حائل نہ ہوسکا، شبلیؒ کے لائق وفائق شاگردوں نے شبلیؒ سے حاصل ہونے والی مذاقِ تحقیق وسلیقہ تصنیف کی میراث کو توشۂ راہ بنا کر اس کارواں کو ایسی کمالِ مہارت اور تیز رفتاری سے جادہ پیما کیا کہ سنگِ راہ دونیم ہوئے، غبار کارواں سے کارواں کی عظمت وعزیمت کا پتہ چلا اور ایسے نقوش ثبت ہوئے کہ آج بھی ان کے نشانِ قدم منزل کا سراغ دیتے ہیں۔

اختصاص کے شعبے ہوں یا انگریزی زبان کے گھنٹے، جدید علوم وفنون کی تدریس ہو یا جدید علمِ کلام مدون کرنے کی تجویز، تحقیق وتالیف کی تربیت ہو یا بہ طور مطالعہ تاریخ کا موضوع، آریوں اور سناتن دھرمیوں سے نمٹنے کے لیے خصوصی درسگاہوں کا قیام ہو یا مغربی حملوں کا جواب دینے کے لیے طلبہ وفضلا کی تربیت، سب کا سرِ رشتہ علامہ شبلیؒ کی فکر سے جڑتا نظر آتا ہے۔

جو ہے پردوں میں پنہاں چشم بینا دیکھ لیتی ہے
زمانے کی طبیعت کا تقاضا دیکھ لیتی ہے

محمد واحد علی خان ایڈوکیٹ۔صدر ڈیسنٹ ایجوکیشن سوسائٹی حیدرآباد

اقبال اور آزاد ایک ہی عہد کے دو بڑے مفکّر

ڈیسنٹ ایجوکیشن سوسائٹی کے زیر اہتمام جلسہ

''بیاد علامہ اقبال و مولانا ابوالکلام آزادؒ'' سے دانشوروں کا خطاب

حیدرآباد۔ 7/نومبر (راست) علامہ محمد اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد عہدِ حاضر کے دو عظیم اسلام شناس ہیں۔ دین کی تفہیم وتعبیر میں ہر دو شخصیات کے ہاں گہری مماثلت بھی پائی جاتی ہے اور شدید اختلاف بھی۔ اقبال نے جہاں اپنے سیاسی فکر وعمل میں ہندوستانیت سے اسلامیت کی جانب پیش قدمی کی وہاں مولانا آزاد نے اسلامیت سے ہندوستانیت کی جانب مراجعت کا راستہ اختیار کیا۔ اجماع کے اس سیاسی ردّوقبول سے قطع نظر اقبال اور ابوالکلام آزاد ہر دو برصغیر کے مسلمانوں کی آنکھ کا تارا ہیں۔ دونوں کو عقیدت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ محمد واحد علی ایڈوکیٹ ڈیسنٹ ایجوکیشن سوسائٹی کے زیر اہتمام اردو گھر مغل پورہ میں جلسہ ''بہ یاد علامہ اقبالؒ و مولانا ابوالکلام آزادؒ و مشاعرہ'' کے صدارتی خطاب سے کر رہے تھے۔ اس موقع پر کلیدی خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد ناظم علی سابق پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج نے کہا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت ہندوستان کی تاریخ میں ایک باب اور ایک عہد کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ جامع الکمال اور عدیم المثال ہیں۔ ان کی ہمہ جہت شخصیت کی نظیر ہے کہ انھوں نے بحیثیت مقرر و محرر یکساں مقبولیت حاصل کی۔ وہ ملکی و ملی قائدانہ صلاحیت سے بھرپور تھے۔ تاریخی و تہذیبی شخصیت کے ساتھ انھوں نے مذہبی، ادبی اور سیاسی و صحافتی میدان میں بھی نمایاں خدمات انجام دیے۔

جب کہ علامہ اقبالؒ اس وقت جو نظمیں کہیں، ان میں ''خضرِ راہ''، گل سرسبو کا حکم رکھتی ہے جس کا ہر بند شعر و ادب، دروں بینی اور حقیقت شناسی کا شاہکار ہے لیکن ''طلوعِ اسلام'' بین الغزل کا حکم رکھتا ہے جس کی مثال اسلامی ادب میں مشکل سے کہیں اور مل سکے گی۔ اس کی اشاعت کے بعد کا دوران کی وفات تک فکری پختگی اور دائرۂ علم کی وسعت و بے

کرانی کے لئے مشہور ہے۔ اسی دور میں ان کا نصب العین اور دعوت و پیغام میں وضاحت وقطعیت پیدا ہوئی اور ان کا فارسی مجموعہ کلام بھی سامنے آیا۔ جس ملت کو بیدار کرنے کا کام کیا۔ مولانا صوفی خیرالدین صدر صوفی علماء کونسل نے کہا کہ اقبال کی نظمیں اِس بات کی شاہد ہے کہ دورِ اوّل کے ابوالکلام آزاد کے فکر و عمل کو اقبال تحسین کی نظر سے دیکھتے تھے۔ دین کی تفہیم وتعبیر میں ہر دو شخصیات کی فکری مماثلت کا اندازہ ''الہلال'' اور ''البلاغ'' میں شائع ہونے والے مولانا کے مضامین اور اقبال کی شاعری سے کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی ایڈیٹر ماہنامہ میگزین صدائے شبلی نے کہا کہ علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی پر مولانا شبلی نعمانی کا اثر رہا ہے۔ علامہ اقبال کی شاعری کی دو بڑی خصوصیات بامقصد۔ آفاقی اور فلسفۂ خودی، تخیل کی بہت بلندی ساتھ میں تعمیری اور تخیل کے فلسفہ سے ملت کو آگاہ کیا۔ عبدالحامد منان نے کہا کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے ملک کی آزادی وخوشحالی کے لیے سرگرم سیاست میں حصہ لیا، انگریز حکمرانوں کی بربریت کے خلاف محاذ آرائی کی اور جہد مسلسل میں شریک رہے۔ مولانا آزادئ ہند اور انگریز حکومت کے درمیان مضبوط چٹانی عزائم کے ساتھ حائل رہے۔ غبار خاطر کے خطوط میں پائی جانے والی انشا پردازانہ صفات کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ خطوط کم اور انشائیے زیادہ ہیں۔ انشائیہ کی تعریف میں بھی یہ بات ملتی ہے کہ کسی بھی موضوع پر ہلکے پھلے انداز میں لکھی ہوئی تحریر انشائیہ کہلائے گی جس میں مصنف کے جذبات اور اس کے اسلوب نگارش کی جھلک دکھائی دے۔ اس لحاظ سے غبار خاطر کے خطوط اردو انشائیوں کے بہترین نمونے قرار پاتے ہیں۔ ڈاکٹر سید حبیب امام قادری نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد، ہر دو عہد آفریں شخصیات ہماری اپنی ہیں۔ دونوں کی جہدِ حیات برصغیر کے مسلمانوں کا سرمایۂ افتخار ہے۔ اگر اقبال نے پورے برصغیر کے مسلمانوں کو ایک جداگانہ قوم قرار دیا تو آزاد نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک متحدہ قوم کی صورت دینے میں ناکام ہوکر بالآخر بھارتی مسلمانوں ہی کو اپنی قوم سمجھا۔ مولانا آزاد نے 23 اکتوبر 1947 کو دہلی کی تاریخی جامع مسجد کی فصیل سے ایک تاریخی تقریر کی، جس کی بدولت تقسیم کے سانحہ اور قتل وغارت گری سے پریشان بھارتی مسلمانوں میں اپنے وطن اور مٹی سے جڑے رہنے کی ہمت پیدا ہوئی۔ اقبال دل سے چاہتے تھے کہ قرآن کی حکومت بروے کار آئے اور اسلام پر بالکل ایک نئی دنیا کی تعمیر ہو، علاّمہ اقبال اُمّتِ مسلمہ کے اتحاد میں مغربی تصورِ قومیت کو تباہ کن خیال کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ رنگ، نسل، وطن، ذات اور برادری اسلامی اتحاد قائم کرنے میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ اُمّت مسلمہ کا اتحاد وحدتِ مذہب وتمدن پر قائم ہے۔ بعدازاں مشاعرہ ڈاکٹر ناقد رزاقی کے صدارت میں عمل میں آیا۔ سردار سلیم، ڈاکٹر طیب پاشاہ قادری، سید سمیع اللہ حسینی، حکیم سید خیرالدین صوفی قادری، شکیل رزاقی مشاعرہ کے مہمان خصوصی کے طور پر کلام سنایا۔ ان کے علاوہ وحید پاشاہ قادری، سید سراج مدنی سہروردی، سید سہیل عظیم، تشکیل انور رزاقی، ڈاکٹر ممتاز سلطانہ، جہانگیر قیاس، سراج یعقوبی، سید عبدالشکور شاداب، جلیس بھارتی نے کلام سنایا۔ ادبی جلسہ ومشاعرہ کی نظامت مایہ ناز شاعر وناظم مشاعرہ سید سہیل عظم نے کی۔

☆☆☆

مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاسی، مذہبی، سماجی، ادبی وصحافتی خدمات کو خراج

بزم علم وادب کے مولانا آزاد ریاستی علمبردار اردو ایوارڈس کی پیشکشی

حیدرآباد (راست) مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت اوران کی مختلف شعبہ حیات میں گراں قدر خدمات ملک وملت اور قوم کے لئے قابل تقلید ہے۔ جس سے نوجوان نسل کو واقف کرانا دانشوروں کی ذمہ داری ہے اور میدان عمل میں ان ہی اقدامات کی طرف رہنمائی کرنی چاہئے۔ تعلیم کے حصول اور مطالعہ کا شوق پیدا کرنا ضروری ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر مجید بیدار (سابق صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ) نے بزم علم وادب کی جانب سے مسدوسی ہاؤز، مغلپورہ میں منعقدہ مولانا ابوالکلام آزاد ریاستی علمبر اردو ایوارڈ وتوصیف ناموں کی پیشکشی کی تقریب میں کیا۔ ڈاکٹر سید اسلام مجاہد نے کہا کہ ملک کی آزادی کیلئے مولانا کی قربانیاں ناقابل فراموش ہیں۔ وزیر تعلیم کی حیثیت سے انہوں نے تعلیم کے فروغ کیلئے بہت بڑا بجٹ قائم کیا تھا تاکہ ہر باشندہ تعلیم یافتہ ہو جس سے ملک صحیح رخ پر ترقی کر سکے۔ مولانا ڈاکٹر محامد ہلال اعظمی (مدیر ماہنامہ صدائے شبلی) نے کہا کہ مولانا آزاد کو مطالعہ کا بڑا شوق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کم عمری ہی سے صحافت کے میدان میں لوہا منوا چکے تھے۔ الہلال اور البلاغ رسالوں کے علاوہ دیگر رسائل اور اخبارات کی بھی وہ رہنمائی کرتے ہوئے عوام الناس میں ملک سے محبت کے جذبے کو پروان چڑھایا۔ ڈاکٹر ناظم علی نے مولانا کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ مولانا نے ہر میدان میں یعنی سیاسی، مذہبی، سماجی، تعلیمی اور قوم وملت میں اتحاد کو پروان چڑھانے میں ہر طرح سے کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ آخر میں ڈاکٹر نادر المسدوسی (صدر بزم علم وادب) نے تمام شرکاء کو یہ پیغام دیا کہ مولانا ابوالکلام آزاد ہو کہ دیگر ہمارے اکابرین سب کے سب مخلص تھے اور وہ دنیا کو دینا جانتے تھے۔ وہ خودغرض اور مفاد پرست نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آج بھی لوگوں کے دلوں میں زندہ ہیں اور قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ تقریب کا آغاز مولانا محامد ہلال اعظمی کی قرأت کلام پاک اور الحاج اکبر خان اکبر اور اقبال درد کی نعت شریف سے ہوا۔ اس موقع پر ورنگل کے شاعر اقبال درد، اکبر خان اکبر، میر اشفاق احمد کی شالپوشی وگلپوشی کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد ریاستی علمبردار اردو ایوارڈ وتوصیف نامے پروفیسر مجید بیدار، ڈاکٹر اسلام الدین مجاہد اور ڈاکٹر ناظم علی ودیگر کے ہاتھوں پیش کئے گئے۔ ایوارڈیافتگان نے بزم علم وادب کے ذمہ داروں کا شکریہ ادا کیا۔ محسن خان نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ بعدازاں صوفی سلطان شطاری کی نگرانی میں نعتیہ مشاعرہ منعقد ہوا۔ نگران مشاعرہ کے علاوہ شیخ اسماعیل صابر، طاہر گلشن آبادی، اکبر خاں اکبر، اقبال درد، نوید جعفری، افتخار عابد، بصیر خالد، ڈاکٹر خواجہ فرید الدین صادق، شاہنواز ہاشمی، لطیف الدین لطیف اور ڈاکٹر نادر المسدوسی نے نعتیہ کلام پیش کیا۔ مشاعرہ کی نظامت افتخار عابد نے انجام دی۔ احمد بامسدوس اور مصعب بامسدوس نے انتظامات میں حصہ لیا۔ آخر میں ڈاکٹر ناظم علی نے شکریہ ادا کیا۔

یوم تعلیم پر مولانا ابوالکلام آزاد کو خراج عقیدت

ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

ان کی ملی، ملکی، علمی، ادبی، سیاسی، سماجی، صحافی خدمات لائق مثال وتقلید ہے، اللہ تعالی ان کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے آمین ثم آمین۔ اوران کے افکار وخیالات کے مطابق ہمارا ملک ہندوستان ترقی کی راہوں پر آگے بڑھے۔ پروگرام کے روح رواں سید عثمان رشید ایڈیٹر روزنامہ مہنگاء کامیاب پروگرام کرانے پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد آزاد کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے عثمان رشید ایڈیٹر روزنامہ مہنگاء کو مبارک باد پیش کرتا ہے۔ ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد کے ایڈیٹر مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی تصویر میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اور منتظمین نے انھیں تہنیت پیش کیا جزاک اللہ خیرا۔

مرحبا اے ابو الکلام آزاد تا قیامت رہے گی تیری یاد
قید خانوں میں خود رہا برسوں ملک کو قید سے کیا آزاد

DR. S.J HUSSAIN
MD (Unani)
Former director Incharge
Central Research Institute Of Unani Medicine
Govt of India

website: www.unanicentre.com
Email:syedjalilhussain@gmail.com
jaleel_hussain@yahoo.com

Dr. Jaleel's

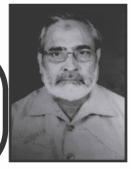

یونانی سینٹر فار کارڈیک کیر
UNANI CENTER FOR CARDIAC

Consultation Time
Morning: 9:00 am to 2:00 pm
(Friday Morning and Sunday Evening Closed)

Cell:
+91 8142258088
+91 7093005707

Adress -: No: 8-1-332/3/B-69, RoadNo 1(A)Arvind Nagar Colony
Tolichowk Hyderabad - 500008 T.S India

شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل اینڈ چیریٹیبل ٹرسٹ، حیدرآباد

SHIBLI INTERNATIONAL

EDUCATIONAL & CHARITABLE TRUST

Regd. No. 180/2016

مدرسہ ومسجد کے تعاون کی اپیل

حدیث نبوی ﷺ ہے خَیرُکُم مَن تَعَلَّم القُرآن وَعَلَّمَہ ۔ تم میں بہترین انسان وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔ اس حدیث سے علم اور قرآن علم کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اسی علم کی نشرواشاعت کے لئے **مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم** ۱۵/جنوری ۲۰۱۷ء کو قائم کیا گیا تاکہ امت مسلمہ کے نونہالان زیور علم سے آراستہ ہوں اور ملک وملت کی خدمت میں وقف ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے۔ آمین یارب العٰلمین۔

مدرسہ ہذا کی کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے۔ جملہ اخراجات کی ادائیگی اہل خیر حضرات کے تعاون سے ہوتی ہے۔

الحمدللہ مدرسہ میں تعمیری کام بھی جاری ہے، اس وجہ سے اہل خیر حضرات سے گذارش ہے کہ مدرسہ کا نقد یا اشیاء کے ذریعہ تعاون فرماکر یا کسی طالب علم کی کفالت لیکر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔ نوازش ہوگی۔

مسجدِ الٰہی

زیر انتظام شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل اینڈ چیریٹیبل ٹرسٹ حیدرآباد کا تعمیری کام جاری ہے۔ الحمدللہ ثم الحمدللہ ایک مخیرّہ خاتون نے 126 گز اراضی ٹرسٹ ہذا کو مسجد کے لئے وقف کیا ہے، اللہ تعالیٰ مخیرّہ کو دونوں جہاں میں بہترین بدلہ دے، آمین۔ مسجدِ الٰہی کی زمین مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم وادیٔ عمر شاہین نگر حیدرآباد کا (اقامتی وغیر اقامتی) ادارہ ہے، جو شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ کے زیر انتظام 2017 سے خدمات انجام دے رہا ہے، بالکل اسی سے متصل ہے۔ مدرسہ ہذا اور بستی کے لئے مسجد ناگزیر ہے، اس وجہ سے آپ تمام حضرات سے گزارش کی جاتی ہے کہ مسجد ہذا کے تعمیری کام میں نقد یا اشیاء کے ذریعہ معائنہ کرکے حصہ لے کر ثوابِ دارین حاصل کریں۔

جزاک اللہ خیرًا احسن الجزاء.

Bank Name : IDBI **A/c Number : 1327104000065876**

A/c Name : SHIBLI INTERNATIONAL EDUCATIONAL AND CHARITABLE TRUST

IFSC Code : IBKL0001327. Branch: Charminar

G Pay & Phone Pay : 8317692718, WhatsApp: 9392533661

العارض: حافظ وقاری مفتی ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی خطیب مسجد عالیہ، بانی وناظم مدرسہ ہذا چیرمین شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد